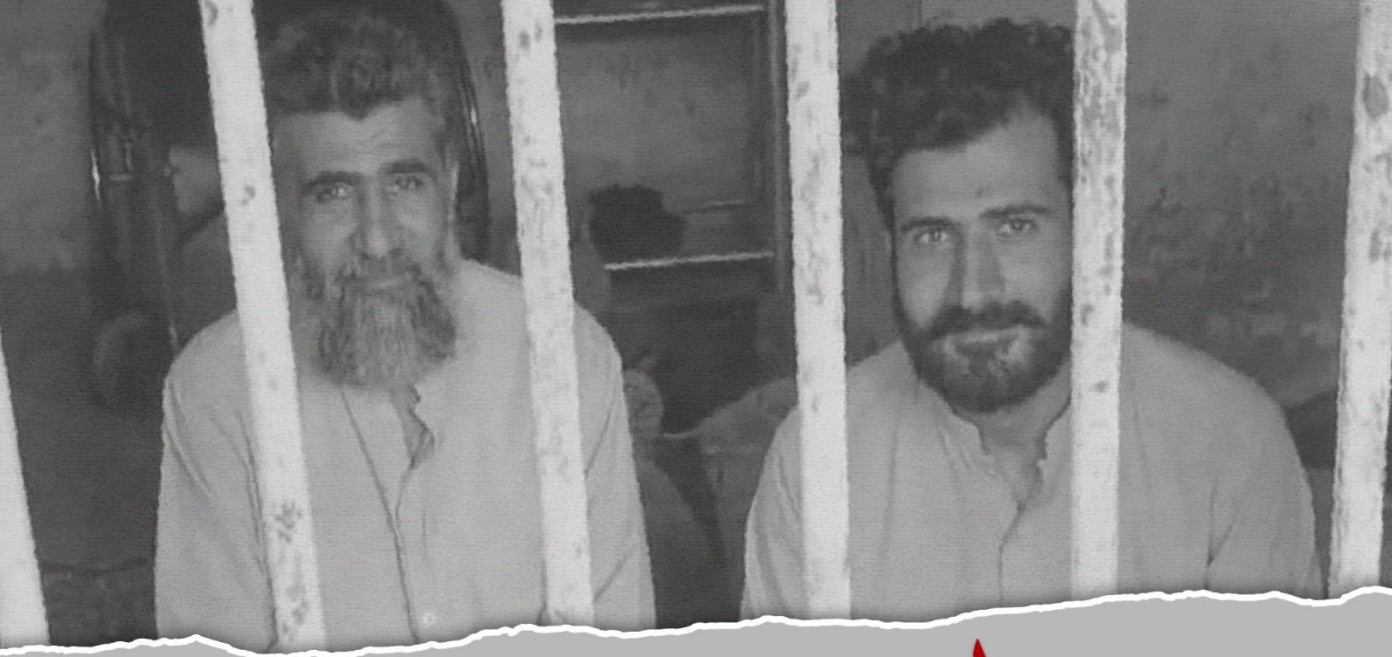


مزاحمتی یادداشت



مزاحمتی یاداشت

مزاحمتی یاداشت

برمش پبلیکیشنز

بلوچ یکجہتی کمیٹی

مزاحمتی یاداشت

میگزین برائے دستاویزیات یاداشت

ناشر: برمش پبلکیشنز

سال اشاعت: 2026

صفحات: 134

2026 ©برمش پبلکیشنز تمام حقوق محفوظ ہیں۔ بغیر تحریری اجازت کے، اس اشاعت کا کوئی بھی حصہ کسی بھی شکل یا ذریعے سے نقل، ذخیرہ یا منتقل نہیں کیا جا سکتا، سوائے غیر تجارتی، تعلیمی، تحقیقی، اور انسانی حقوق کے فروغ کے مقاصد کے لیے، بشرطیکہ مناسب حوالہ دیا جائے۔ یہ اشاعت عوامی آگاہی اور دستاویزی ریکارڈ کی وکالت کے لیے تیار کی گئی ہے۔

تعارف میگزین

یہ میگزین **"مزاحمتی یاداشت "**بلوچ یکجہتی کمیٹی کی قیادت، ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ، سبغت اللہ شاہ جی، بیبرگ بلوچ، بیبو بلوچ اور گل زادی بلوچ، کی گرفتاری کے ایک سال مکمل ہونے پر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ میگزین ان اسیر رہنماؤں کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مضامین، خطوط، تجزیے اور مکالمے جیل کی کوٹھڑیوں میں تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ تحریریں کسی پرسکون کمرے میں نہیں لکھی گئیں؛ بلکہ عسکری نگرانی، تنہائی کی طویل راتوں، عدالتی پیشیوں کی تھکن اور غیر یقینی مستقبل کے سائے میں وجود میں آئیں۔ ہر سطر میں قید کی فضا محسوس ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود ہر سطر میں آزادی کی خوشبو بھی بسی ہوئی ہے۔

"مزاحمتی یاداشت "ایک سالہ اسیری کی یاد تو ہے، مگر شکست کی نہیں بلکہ استقامت اور حوصلے کی علامت ہے۔ یہ میگزین کسی سانحے کی ماتمی روداد نہیں بلکہ عزم کی تجدید کا اظہار ہے۔ یہ ان دنوں کی دستاویز ہے جن میں وقت سست پڑ جاتا ہے مگر یقین کی رفتار کم نہیں ہوتی۔ یہ اس سفر کی علامت بھی ہے جس میں پابندِ سلاسل رہتے ہوئے بھی انسان اپنے مقصد اور اپنے یقین سے غافل نہیں ہوتا۔

یہ میگزین پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں بلوچ یکجہتی کمیٹی کی قائد ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کی تحریریں، خطوط اور انٹرویو شامل ہیں۔ دوسرا باب بلوچ یکجہتی کمیٹی کے مرکزی رہنما بیبرگ بلوچ کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب مرکزی رہنما سبغت اللہ شاہ جی کے پیغامات اور تحریروں پر مشتمل ہے۔ چوتھا باب بی وائی سی کے رکن بیبو بلوچ کے مضامین پر مشتمل ہے، جبکہ آخری باب بی وائی سی کی رکن گل زادی بلوچ کی تحریروں پر مشتمل ہے۔

فہرست

تعارف میگزین III

اداریہ 1

باب اول: ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ 6

تعارفِ ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ 6

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کا خصوصی انٹرویو 10

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کا مکمل انٹرویو: دی گارڈین میں شائع ہونے والی گفتگو کا غیر مطبوعہ تفصیلی متن 17

جیل سے اپنے خاندان کے نام خط 28

جیل سے بی وائی سی کے کارکنان کے نام خط 30

عید کے روز بلوچ قوم کے نام خط 33

ہمیں کیا کرنا ہے؟ 42

قید سے بلوچ نوجوانوں کے نام پیغام 45

ماما قدیر کو قومی جدوجہد میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا 49

باب دوم: بیبرگ بلوچ 52

تعارف بیبرگ بلوچ 52

بیانیے کی جنگ اور لاپتہ انسانوں کا المیہ 55

مزاحمت اور بلوچ شیر ذال 57

مزاحمت نے ہمیں چنا ہے۔ 62

عید کی خوشی میں اپنے گمشدہ لوگوں کی یاد 66

باب سوئم: صبغت اللہ شاہ جی 68

تعارفِ صبغت اللہ 68
یہاں بشار الاسد کے والد کا دور چل رہا ہے 71
فورتھ شیڈول، ففتھ شیڈول، سکسٹھ شیڈول 73
بلوچ خواتین کی جبری گمشدگی 75
ریسٹ اِن پاور، ماما 77
بلوچستان غیر بلوچ دانشوروں کے نقطۂ نظر سے 79

باب چہارم: بیبو بلوچ 87

تعارف بیبو بلوچ 87
خاموش نسل کشی 89
نہ اصول، نہ کوئی قانون، سب ایک تھیٹر کی طرح، اور کچھ نہیں 94
زمین کے وارث 97

باب پنجم : گل زادی بلوچ 101

تعارفِ گلزادی بلوچ 101
ہماری عیدیں 103
بلوچ خواتین، ٹارچر سیلوں و بندوق کو مات دیں گے 107
جبری گمشدگیاں اور بلوچ خواتین کی ناقابلِ شکست جدوجہد 112
اماں ہوری کی یاد میں 118
سنگت نظرمری کے نام 121
انصاف کا جنازہ : بلوچستان میں عدلیہ اور ریاستی جبر کی کہانی 123

اداریہ

تاریخ کے کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں جب خاموشی بھی گواہی بن جاتی ہے، جب قید بھی بیان میں ڈھل جاتی ہے، اور جب تحریر مزاحمت کی سب سے طاقتور صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے لمحے معمول کے نہیں ہوتے؛ وہ زمانے کا رخ متعین کرتے ہیں۔ وہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ طاقت صرف ہتھیاروں، عدالتوں یا ایوانوں میں نہیں ہوتی، بلکہ حافظے، شعور اور قلم میں بھی ہوتی ہے۔ جب بولنے والوں کو خاموش کیا جاتا ہے تو الفاظ زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ جب راستے بند کیے جاتے ہیں تو فکر نئی راہیں تراشتی ہے، اور جب جسموں کو دیواروں کے پیچھے محدود کر دیا جاتا ہے تو نظریات دیواروں سے بلند ہو جاتے ہیں۔

یہ الفاظ صرف کاغذ پر نہیں اُترے، بلکہ زنجیروں، اذیت، انتظار اور نظریاتی استقامت کے درمیان ڈھلے ہیں۔ یہاں تحریر صرف اظہار نہیں بلکہ ایک عمل ہے: خود کو زندہ رکھنے کا عمل، تحریک کو مربوط رکھنے کا عمل، اور تاریخ کے سامنے اپنی گواہی درج کروانے کا عمل۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ جب آوازوں کو دبایا جاتا ہے تو وہ تحریر میں منتقل ہو جاتی ہیں، اور پھر تحریر زمانے کی سماعت بن جاتی ہے۔

"مزاحمتی یاداشت" کسی وقتی ردِعمل کا اظہار نہیں ہے۔ یہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں بلکہ سیاسی شعور کی ایک سنجیدہ دستاویز ہے۔ اسے ایک سال کے تجربے کو محض تاریخ میں درج کرنے کے لیے مرتب نہیں کیا گیا، بلکہ اسے سمجھنے، پرکھنے اور آئندہ کی سمت متعین کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ میگزین ایک ایسے سیاسی عہد کی نشاندہی کرتا ہے جس میں عوامی

مزاحمت کو جرم قرار دیا گیا، اختلافِ رائے کو خطرہ سمجھا گیا، اور اجتماعی تنظیم کو ایک چیلنج کے طور پر دیکھا گیا۔

لیکن یہ میگزین اس کے ساتھ ساتھ ایک اور حقیقت بھی ثبت کرتا ہے: جب جسم قید ہو جائے تو بھی شعور آزاد رہتا ہے۔ جب راستے بند ہو جائیں تو بھی فکر کا سفر جاری رہتا ہے۔ جب قیادت سلاخوں کے پیچھے ہو تو بھی تحریک ختم نہیں ہوتی بلکہ نئی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ میگزین دراصل اس اعلان کی صورت ہے کہ مزاحمت کو سلاخوں کے پیچھے دفن نہیں کیا جا سکتا۔

مزاحمت صرف سڑکوں پر ہونے والا احتجاج نہیں ہوتی۔ یہ یادداشت کا تسلسل ہے، سوال اٹھانے کی جرأت ہے اور اصولوں پر قائم رہنے کا نام ہے۔ اگر اسے خاموش کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، اور اگر اسے محدود کیا جائے تو یہ اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔

"مزاحمتی یاداشت"دراصل ایک اجتماعی یادداشت کی حفاظت ہے۔ یہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب قید کے اندر بیٹھ کر بھی نظریہ زندہ رکھا گیا، جب تحریر کو ہتھیار بنایا گیا، اور جب خاموشی کو گواہی میں بدل دیا گیا۔ یہ صفحات صرف موجودہ لمحے کے لیے نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کے لیے محفوظ کیے گئے ہیں۔

سیاسی تاریخ محض واقعات، گرفتاریاں، احتجاج یا ریاستی اعلانات کا مجموعہ نہیں ہوتی؛ وہ دراصل بیانیوں کی کشمکش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہر دور میں طاقت اپنے آپ کو صرف قانون، فوج یا انتظامیہ کے ذریعے نہیں بلکہ ایک مخصوص فکری اور ثقافتی بیانیے کے ذریعے بھی قائم رکھتی ہے۔ جب کوئی ریاست یا غالب قوت کسی معاشرے کی نمائندگی خود طے کرنے لگتی ہے تو اس کے خلاف مزاحمت ایک فطری عمل بن جاتی ہے۔ اسی تناظر میں مزاحمتی ادب، عوامی مزاحمت اور خواتین کی قیادت کو جدید سیاسی فکر میں محض سماجی رجحانات نہیں بلکہ تاریخی تشکیل

کے بنیادی عوامل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ عناصر مل کر نہ صرف طاقت کے بیانیے کو چیلنج کرتے ہیں بلکہ متبادل تاریخی شعور بھی تخلیق کرتے ہیں۔

نوآبادیاتی اور بعد از نوآبادیاتی مطالعات میں اس بات پر وسیع بحث موجود ہے کہ تسلط صرف زمین پر قبضہ نہیں ہوتا بلکہ نمائندگی پر بھی قابض ہو جاتا ہے۔ فلسطینی مفکر **ایڈورڈ سعید** اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ سامراجی طاقتیں محکوم معاشروں کو اپنے الفاظ میں بیان کرتی ہیں، اور یہی بیان بعد میں حقیقت سمجھا جانے لگتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں مزاحمتی ادب ایک فکری بازیافت کا عمل بن جاتا ہے، یعنی اپنی تاریخ، اپنی شناخت اور اپنے تجربے کو خود بیان کرنا۔ یہ عمل محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ سیاسی خودمختاری کی ابتدائی شرط ہے۔

اسی طرح **میشل فوکو** نے علم اور طاقت کے تعلق پر گفتگو کرتے ہوئے واضح کیا کہ جو بیانیہ غالب ہو جائے وہی سچائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر کسی تحریک کو اپنے بارے میں پھیلائے گئے سرکاری یا غالب بیانیے کا توڑ کرنا ہو تو اسے متبادل فکری مواد پیدا کرنا پڑتا ہے۔ مزاحمتی ادب یہی متبادل فکری سرمایہ مہیا کرتا ہے۔ اطالوی مفکر **انتونیو گرامشی** کے نظریۂ غلبہ کے مطابق ریاست صرف جبر سے نہیں بلکہ رضامندی پیدا کر کے حکمرانی کرتی ہے؛ مزاحمتی ادب اسی رضامندی کو توڑ کر ایک نئے شعور کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس طرح ادب تحریک کو نظریاتی گہرائی دیتا ہے اور وقتی ردِعمل کو فکری تسلسل میں بدل دیتا ہے۔

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو الجزائر، جنوبی افریقہ، فلسطین اور لاطینی امریکہ کی تحریکوں میں مزاحمتی تحریروں نے نہ صرف عوامی بیداری پیدا کی بلکہ بعد میں تاریخ نویسی کے بنیادی مآخذ کا درجہ بھی حاصل کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب محض ثقافتی سرگرمی نہیں بلکہ ایک سیاسی دستاویز بھی ہے۔ جب سرکاری ریکارڈ غاصبانہ ہو تو تحریر ہی وہ ذریعہ بنتی ہے جو اجتماعی یادداشت کو محفوظ رکھتی ہے۔

جیل کو عام طور پر خاموشی کی جگہ سمجھا جاتا ہے، مگر سیاسی تاریخ میں یہی جگہ اکثر فکری پیداوار کا مرکز ثابت ہوئی ہے۔ جب کوئی رہنما یا کارکن اپنے نظریے کی خاطر قید برداشت کرتا ہے تو اس کے الفاظ میں ایک مخصوص اخلاقی وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وزن اس لیے اہم ہوتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں اخلاقی ساکھ طاقت سے کہیں زیادہ دیرپا اثر رکھتی ہے۔

جنوبی افریقہ میں **نیلسن منڈیلا** کی اسیری نے ان کی تحریروں اور موقف کو عالمی سطح پر ایک اخلاقی معیار عطا کیا، جس نے اپارتھائیڈ مخالف تحریک کو عالمی ضمیر سے جوڑ دیا۔ بلوچ تحریک میں بھی **حمید بلوچ** جیسے نڈر کارکن کی داستان ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے اصولوں اور نظریات پر ثابت قدم رہ کر تاریخ کے اوراق میں جگہ بنائی۔ ان کی تحریریں آج بھی ہماری تحریکی نشوونما کے لیے جرأت، توانائی اور نظریاتی طاقت فراہم کرتی ہیں۔

اسی طرح گرامشی نے فاشسٹ حکومت کے دوران قید میں رہتے ہوئے جو نظریاتی نوٹس تحریر کیے، وہ بعد میں جدید سیاسی فکر کی بنیادوں میں شامل ہو گئے۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جیل کی تحریر محض ذاتی ڈائری نہیں رہتی بلکہ نظریاتی ارتقاء کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ لاطینی امریکہ میں فوجی آمریتوں کے دور میں قیدیوں کی تحریریں انسانی حقوق کی تحقیقات اور عدالتی کارروائیوں میں بطور شہادت استعمال ہوئیں، جس سے یہ ثابت ہوا کہ اسیری کی تحریر تاریخ کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

قید کا تجربہ ایک ایسے زاویۂ نظر کو جنم دیتا ہے جو طاقت کے مرکز سے باہر کھڑا ہوتا ہے، اور یہی فاصلہ تحریر کو تنقیدی گہرائی عطا کرتا ہے۔ اسیری کی تحریریں ریاستی بیانیے کو چیلنج کرتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ طاقت کے باوجود سچائی کو مکمل طور پر دبایا نہیں جا سکتا۔ اس طرح جیل کی تحریر احتجاج کو دستاویزی حیثیت میں بدل دیتی ہے۔

اگر مزاحمتی ادب بیانیے کی تشکیل کرتا ہے، اسیری کی تحریریں اسے اخلاقی ساکھ عطا کرتی ہیں، اور خواتین کی قیادت اسے سماجی وسعت فراہم کرتی ہے، تو یہ تینوں عناصر مل کر ایک ایسی

تاریخی قوت پیدا کرتے ہیں جو وقتی سیاسی حالات سے بلند ہو جاتی ہے۔ تحقیق اور عالمی تجربات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جب یہ عناصر ایک تحریک میں یکجا ہو جائیں تو وہ تحریک صرف احتجاج نہیں رہتی بلکہ تاریخ کا مستقل حوالہ بن جاتی ہے۔

تاریخ طاقت کے اعلانات سے نہیں بلکہ ان آوازوں سے بنتی ہے جو دباؤ کے باوجود بولتی رہتی ہیں، لکھتی رہتی ہیں اور قیادت کرتی رہتی ہیں۔

ایڈیٹر

برمش پبلی کیشنز

شال، بلوچستان

باب اول: ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ

تعارفِ ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ ایک مزاحمتی بچی سے اٹھ کر بلوچ مزاحمتی سیاسی جدوجہد کی علامت بن چکی ہیں۔ ان کی پیدائش یکم جنوری 1993 کو ہدہ، کوئٹہ میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کوئٹہ سے حاصل کی۔ بعد ازاں بولان میڈیکل کالج کوئٹہ سے ایم بی بی ایس مکمل کیا اور اپنی گرفتاری سے قبل سرجری میں پوسٹ گریجویٹ ریذیڈنسی کر رہی تھیں۔

ان کی سیاسی جدوجہد کا آغاز دراصل ان کے گھر سے ہوا، جب ان کے والد میر عبدالغفار لانگو، جو خود بھی ایک سیاسی کارکن تھے، کو دوسری مرتبہ 2006ء میں گرفتار کیا گیا۔ اس واقعے کے وقت ماہ رنگ ایک کم سن بچی تھیں، لیکن اپنے والد کی غیر قانونی گرفتاری کے خلاف کوئٹہ پریس کلب کے سامنے ہونے والے مسلسل احتجاجوں میں شریک ہوتی رہیں۔

2009 میں جب غفار لانگو کو جبری طور پر لاپتہ کیا گیا تو اس وقت ماہ رنگ صرف 16 برس کی تھیں۔ اسی مرحلے پر انہوں نے اپنے والد کی جبری گمشدگی کے خلاف ایک سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ 2011 میں ان کے والد کی تشدد زدہ اور مسخ شدہ لاش برآمد ہوئی۔ چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہونے کے باعث پانچ بہنوں، ایک بھائی اور پورے خاندان کی ذمہ داری کم عمری ہی میں ماہ رنگ پر آ پڑی۔

ان کی سیاسی جدوجہد میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب 2017 میں ان کے بھائی ناصر بلوچ کو بھی جبری طور پر لاپتہ کر دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد انہوں نے کوئٹہ پریس کلب کے سامنے اپنے

بھائی کی بازیابی کے لیے پرامن دھرنے اور احتجاجی ریلیاں منعقد کیں۔ تین ماہ بعد ان کے بھائی کو رہا کر دیا گیا۔ تاہم ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ نے یہاں رکنے کے بجائے لاپتہ افراد کے خاندانوں کی جانب سے منعقد کیے جانے والے ہر احتجاج اور جلسے میں مرکزی کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ سوگوار ماؤں، بہنوں اور خاندانوں کے ہمراہ انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

2020ء میں ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ اور ان کے فکری و نظریاتی ساتھیوں نے تربت کے علاقے ڈنک میں ریاستی ڈیتھ اسکواڈ کی جانب سے ایک بلوچ گھرانے پر حملے اور ایک خاتون کی شہادت کے خلاف ایک منظم سیاسی تحریک کا آغاز کیا، جو برمش یکجہتی کمیٹی کے نام سے سامنے آئی۔ بعد ازاں یہی تنظیم بلوچ یکجہتی کمیٹی میں تبدیل ہوئی۔ 2024ء میں وہ اس تنظیم کی پہلی خاتون سربراہ بنیں۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ دسمبر 2023 میں بلوچ نسل کشی کے خلاف نکلنے والے تاریخی لانگ مارچ کی صفِ اول کی قیادت میں شامل تھیں۔ انہوں نے کوئٹہ سے اسلام آباد تک لانگ مارچ اور اسلام آباد میں ہونے والے تاریخی دھرنے کی قیادت کی۔ جب لانگ مارچ کے شرکاء ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کی قیادت میں اسلام آباد سے واپس بلوچستان آئے تو کوئٹہ میں ہزاروں افراد نے ان کا تاریخی استقبال کیا اور انہیں ایک مظلوم قوم کی متفقہ آواز اور رہنما قرار دیا۔

جون 2024 میں انہیں اوسلو میں منعقد ہونے والے ورلڈ ایکسپریشن اور پین ناروے کے ایک اجلاس میں مدعو کیا گیا، جہاں انہوں نے بلوچ عوام کی آواز عالمی سطح پر اٹھائی۔ جولائی 2024 میں انہوں نے بلوچ یکجہتی کمیٹی کی سربراہ کے طور پر گوادر میں "بلوچ قومی اجتماع" یا "بلوچ راجی مُچی" کی کال دی تاکہ بلوچ نسل کشی کے خلاف ایک متحد اور پرامن مزاحمت کو منظم کیا جا سکے۔ پوری بلوچ قوم نے ان کی اس اپیل کا بھرپور جواب دیا اور بلوچ یکجہتی کمیٹی کے بینر تلے بلوچ سیاسی تاریخ کا ایک بڑا اجتماع گوادر میں منعقد ہوا۔

2024 میں ٹائم میگزین نے انہیں دنیا کے 100 بااثر افراد کی فہرست میں شامل کیا، جبکہ اسی سال بی بی سی نے بھی انہیں دنیا کی 100 بااثر خواتین کی فہرست میں جگہ دی۔ 2025 میں انہیں نوبل امن انعام کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔ ڈاکٹر ماہ رنگ کی بڑھتی ہوئی عالمی مقبولیت کے باعث پاکستان نے ان پر سفری پابندی عائد کی، ان کا نام فورتھ شیڈول میں شامل کیا گیا اور ان پر متعدد بوگس ایف آئی آرز درج کی گئیں۔ جب ڈاکٹر ماہ رنگ ٹائم میگزین کی دعوت پر نیویارک میں منعقد ہونے والے ٹائم گالا میں شرکت کے لیے جا رہی تھیں تو انہیں کراچی ایئرپورٹ پر روک دیا گیا اور نیویارک جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

جنوری 2025 میں انہوں نے دالبندین میں "بلوچ قومی اجتماع" کی صدارت کی جس میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی اور پاکستانی ریاست کی جانب سے بلوچ نسل کشی کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ ان کی مسلسل جدوجہد اور مقامی، علاقائی اور عالمی سطح پر بڑھتی ہوئی حمایت کے باعث وہ اور بلوچ یکجہتی کمیٹی ریاستی جبر کا نشانہ بن گئے۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کو 22 مارچ 2025 کو کوئٹہ کے علاقے سریاب میں ایک پرامن دھرنے سے گرفتار کر لیا گیا اور ان پر بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے۔ اس کے بعد سے وہ تھری ایم پی او اور متعدد جھوٹے اور جعلی ایف آئی آرز کے تحت قید میں ہیں۔ تاہم ایک سال گزر جانے کے باوجود ریاست پاکستان ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہی ہے۔

انسانی حقوق کی تنظیمیں اور وکلاء برادری مسلسل اس بات پر اپنے خدشات کا اظہار کر رہی ہیں کہ ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ اور بی وائی سی قیادت کے کیس میں عدلیہ پر خفیہ اداروں کا واضح دباؤ موجود ہے اور عدالتی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلے ریاستی منشا کے مطابق کیے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ گزشتہ ایک سال سے ہدہ جیل کوئٹہ میں قید ہیں، جہاں وہ شدید صحت کے مسائل کا سامنا کر رہی ہیں۔ انہیں مناسب طبی سہولیات بھی فراہم نہیں کی جا رہیں، جو ہر قیدی کا بنیادی حق ہے۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کی جدوجہد بلوچ عوام سمیت دنیا بھر کے مظلوم عوام کے لیے حوصلے اور تحریک کا ذریعہ بن چکی ہے۔ ایک خاتون رہنما کی حیثیت سے وہ اس قوم کی امید اور آواز بن گئی ہیں جس کی شناخت اور وجود کو بتدریج مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ریاست پاکستان ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ سے اس لیے خوفزدہ ہے کیونکہ وہ نوآبادیاتی جبر اور ایک پوری قوم کی نسل کشی کے خلاف بلوچ مزاحمت کی علامت بن چکی ہیں۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کا خصوصی انٹرویو

(یہ انٹریو بین القوامی جریدہ دی ڈپلومیٹ میں شائع ہوئی)

از: ہزاران رحیم داد

3جولائی 2025

بلوچ یکجہتی کمیٹی2020 میں اپنے قیام کے بعد سے بلوچ حقوق کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ابتدائی دنوں میں، جب یہ تحریک برمش یکجہتی کمیٹی کے نام سے جانی جاتی تھی، بی وائی سی نے بلوچستان میں پاکستانی ریاست کی جانب سے طاقت کے بے جا استعمال کے خلاف پُرامن احتجاج منظم کیے جن میں جبری گمشدگیاں، ماورائے عدالت قتل اور دیگر اقسام کے جبر شامل ہیں۔

اپنے آغاز سے ہی بی وائی سی کی قیادت خواتین کے ہاتھ میں رہی ہے جن میں ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ نمایاں ہیں۔ 32 سالہ ماہ رنگ اس وقت کارکن بنیں جب ان کے والد کو 2009 میں "لاپتہ" کر دیا گیا۔ وہ رہا تو کر دیے گئے، لیکن 2011 میں دوبارہ اغوا ہوئے اور اس بار قتل کر دیے گئے۔ تب سے ماہ رنگ بلوچستان میں انسانی حقوق اور انصاف کی تحریک کی مرکزی شخصیت رہی ہیں۔ انہیں ٹائم میگزین کی جانب سے 2024 کے 100 بااثر ترین رہنماؤں میں بھی شامل کیا گیا۔

خواتین کی نمایاں قیادت میں چلنے والی بی وائی سی ایک ایسے خطے میں ترقی پسند سیاسی سرگرمی کی نئی نسل کی نمائندگی کرتی ہے جو طویل عرصے سے تنازع اور محرومی کا شکار رہا ہے۔ پاکستانی ریاست نے اس پُرامن عوامی تحریک کے جواب میں وسیع کریک ڈاؤن، گرفتاریاں، غلط معلومات کی مہمات اور بغیر قانونی کارروائی کے حراست جیسے اقدامات کیے۔

مارچ 2025 میں ماہ رنگ کو دیگر بی وائی سی رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کیا گیا، اور تب سے وہ حراست میں ہیں، جہاں ان کے مطابق انہیں "مسلسل بدسلوکی اور ہراسانی" کا سامنا ہے۔ یہ خصوصی انٹرویو، جو ایک ثالث کے ذریعے جیل میں ملاقات کے دوران کیا گیا، اس تحریک کی سوچ اور حکمتِ عملی کی ایک اہم جھلک پیش کرتا ہے۔ حالیہ مہینوں میں اس تحریک نے بلوچستان بھر میں جبری گمشدگیوں اور ریاستی جبر کے خلاف دسیوں ہزار افراد کو متحرک کیا ہے۔

ہزاران رحیم داد: حالیہ مہینوں میں بلوچستان میں مذہبی انتہاپسندی میں تشویشناک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے، خاص طور پر آئی ایس کے پی اسلامک اسٹیٹ خراسان کے ابھرنے کے بعد۔ اس گروہ نے آپ کو نشانہ بنایا ہے، آپ کی تصویر شائع کی اور آپ کو "شر" اور "مغربی ایجنٹ" قرار دیا۔ آپ ان ذاتی حملوں کا کیا جواب دیں گی؟ اور وسیع تر تناظر میں، ایسے گروہوں کا ابھرنا بلوچستان میں ترقی پسند سیاست کے مستقبل کے لیے کیا معنی رکھتا ہے؟

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ: بلوچستان کی مذہبی انتہاپسندی کے حوالے سے ایک پیچیدہ تاریخ ہے۔ تاہم، اس انتہاپسندی کی جڑیں بلوچ معاشرے میں نہیں ہیں۔ واضح شواہد کی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ مذہبی انتہاپسندی بلوچ معاشرے پر مسلط کی گئی اسے باہر سے نصب گیا یے۔ اس کا اثر افغان جنگ کے دوران نمایاں ہوا اور 11/9 کے بعد مزید بڑھ گیا۔ تاریخی طور پر بلوچ معاشرہ بنیادی طور پر سیکولر رہا ہے، جہاں مذہبی، نسلی اور علاقائی رواداری اور بقائے باہمی کو قبول کیا جاتا رہا ہے۔

اسلامک اسٹیٹ کا بلوچستان میں ابھرنا اور مجھے مرتد قرار دینا کوئی نئی بات نہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ مذہبی انتہاپسند عناصر کو ترقی پسند بلوچ سیاسی تحریک اور اس سے وابستہ اساتذہ، ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر صبا دشتیاری، جو جامعہ بلوچستان میں استاد اور دانشور تھے، انہوں نے بلوچستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر ریاست کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ 2011 میں انہیں دن دہاڑے بلوچستان یونیورسٹی کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ ایک مذہبی انتہاپسند گروہ

نے اس قتل کی ذمہ داری قبول کی۔ اسی طرح خضدار میں پروفیسر رزاق زہری کو صرف اس لیے قتل کیا گیا کہ وہ مخلوط تعلیم اور مفت تعلیم کی حمایت کرتے تھے۔ گوادر میں سر زاہد آسکانی اور تربت میں سر رؤف بلوچ بھی اسی طرح نشانہ بنے۔

بلوچستان میں ترقی پسند کارکن دوہری خطرے کا سامنا کرتے ہیں۔ ایک طرف ریاست کی جانب سے جبری گمشدگیاں اور ماورائے عدالت قتل، اور دوسری طرف مذہبی انتہاپسند گروہوں کی جان سے مارنے کی دھمکیاں۔ گزشتہ ماہ اسلامک اسٹیٹ نے میری تصویر جاری کی، مجھے یورپی ایجنٹ اور مرتد قرار دیا اور عوام کو ہمارے پروگراموں میں شرکت سے روکنے کی بات کی۔ یہ زبان وہی ہے جو آئی ایس پی آر کی پریس کانفرنسوں میں میرے خلاف استعمال کی گئی۔ مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ ایسا گروہ ہمارے خلاف فعال کیا جائے گا، کیونکہ گزشتہ 20 سال سے یہی طرزِ عمل دیکھا جا رہا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ ایسی دھمکیاں بلوچستان میں ترقی پسند سیاست کو ختم نہیں کر سکتیں۔ بلوچ سیاسی شعور کافی پختہ ہو چکا ہے اور عوام حقیقت سے آگاہ ہیں۔ جب تک عوام کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے، انتہاپسند حربے ہماری جدوجہد کو خاموش نہیں کر سکتے۔

ہزاران رحیم داد: آپ تین ماہ سے زائد عرصے سے قید ہیں۔ اس دوران آئی ایس پی آر نے متعدد پریس بریفنگز میں آپ کو "دہشت گردوں کی پراکسی" اور "شر کا چہرہ" قرار دیا۔ آپ ان الزامات کو کیسے دیکھتی ہیں؟

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ: گزشتہ تین ماہ سے مجھے غیر قانونی طور پر حراست میں رکھا گیا ہے۔ اس دوران آئی ایس پی آر نے تین سے چار پریس کانفرنسوں میں میرا ذکر کیا اور ہر بار وہی بے بنیاد الزامات دہرائے جیسے کہ "ماہ رنگ دہشت گردوں کی پراکسی ہے" یا "وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے ۔ایک 6 لاکھ فوج اور متعدد انٹیلی جنس اداروں پر مشتمل ریاست ہونے کے باوجود، آئی ایس پی آر میرے خلاف ایک بھی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکا۔ اس کے بجائے جھوٹے الزامات اور میڈیا ٹرائل کے ذریعے کردار کشی کی گئی۔"

۱۹ مارچ کو کوئٹہ پریس کلب میں میری پریس کانفرنس کو بھی غلط انداز میں پیش کیا گیا۔ وہ پریس کانفرنس جعفر ایکسپریس حملے یا مسلح افراد کی لاشوں کی واپسی سے متعلق نہیں تھی، بلکہ انسانی حقوق کے کارکنوں کو درپیش ہراسانی کے بارے میں تھی۔ ہم نے متعلقہ کیس اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے اداروں کو بھی جمع کرائے تھے۔ پریس کانفرنس کی مکمل ویڈیو اور تحریری ریکارڈ موجود ہے، جس سے واضح ہے کہ میں نے کوئی غیر قانونی بات نہیں کی۔ اگر پاکستانی فوج کے پاس کوئی ثبوت ہے تو وہ پیش کرے۔ ہم، ہماری تنظیم اور بی وائی سی نے ہمیشہ تشدد کی مخالفت کی ہے۔

ہزاران رحیم داد: سوشل میڈیا، کھلے خطوط اور آپ کے ساتھیوں کے پیغامات کے ذریعے یہ اطلاعات سامنے آئی ہیں کہ آپ اور بلوچ یکجہتی کمیٹی کے دیگر گرفتار اراکین کو جیل میں ہراسانی، بدسلوکی اور بنیادی حقوق سے محرومی کا سامنا ہے۔ تشدد، بھوک ہڑتال اور بیبو بلوچ کے سنگین معاملے کی بھی خبریں ہیں۔ آپ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی قید کی صورتحال بیان کریں گی؟

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ: جی ہاں، جیل کے اندر ہمیں مسلسل بدسلوکی، ہراسانی اور بنیادی حقوق سے محرومی کا سامنا ہے۔ 24 اپریل کی رات 8 بجے کوئٹہ پولیس اور کاؤنٹر ٹیررازم ڈیپارٹمنٹ (سی ٹی ڈی) کے اہلکار غیر قانونی طور پر جیل میں داخل ہوئے اور مجھے اور میری ساتھیوں بیبو بلوچ اور گلزادی بلوچ کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس واقعے کے دوران بیبو بلوچ کو ہدہ جیل کوئٹہ سے پشین جیل منتقل کیا گیا، جہاں منتقلی کے دوران انہیں شدید تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی بیرک اور باتھ روم کے اندر نگرانی کے کیمرے نصب کیے گئے، جو ان کی نجی زندگی کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ ان کی منتقلی اور غیر انسانی سلوک کے خلاف احتجاجاً ہم نے پانچ دن کی بھوک ہڑتال کی۔ دس دن بعد بیبو بلوچ کو دوبارہ ہدہ جیل لایا گیا، اور انہوں نے مزید دس دن تک بھوک ہڑتال جاری رکھی۔ جیل کے اندر ہمیں مسلسل دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ ہمارے خاندانوں کو بنیادی سہولیات تک رسائی سے روکا گیا ہے، اور کئی بار ہمارے وکلاء کو ہمارے ساتھ ملاقات کرنے سے روکا گیا۔

ہزاران رحیم داد: جعفر ایکسپریس پر حملے کے بعد ریاستی میڈیا اور سرکاری چینلز کے ذریعے آپ اور بی وائی سی پر دہشت گردی کی حمایت کا الزام لگایا گیا، حالانکہ بی وائی سی کو ایک پُرامن انسانی حقوق کی تحریک کے طور پر جانا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں ریاست آپ کی سرگرمیوں کو مجرمانہ رنگ کیوں دینا چاہتی ہے؟

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ: مارچ 2025 میں جعفر ایکسپریس پر مسلح حملے کے بعد ریاست نے اس واقعے کو ہمارے خلاف استعمال کیا۔ ہمارے خلاف شدید کریک ڈاؤن کیا گیا، حالانکہ ہمارا اس حملے یا کسی بھی پرتشدد کارروائی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ایک منظم منصوبے کا حصہ محسوس ہوتا ہے، جس کا مقصد بی وائی سی کو خاموش کرنا تھا، کیونکہ ہم بلوچستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف مسلسل آواز اٹھا رہے تھے۔ ہم نے ہمیشہ ہر قسم کی ناانصافی اور تشدد کے خلاف بات کی ہے، اور یہی پُرامن اختلاف ریاست کو ناقابلِ برداشت ہے۔ اس لیے ہماری عدم تشدد پر مبنی جدوجہد کو مسلح کارروائی سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔

بی وائی سی ایک پُرامن سیاسی تنظیم ہے۔ ہم نے کبھی تشدد کی سیاست اختیار نہیں کی اور نہ ہی اس کی حمایت کی۔ ہمارے کسی بھی احتجاج میں آج تک ایک پتھر تک نہیں ٹوٹا، مگر ریاست نے شروع دن سے ہمارے خلاف طاقت کا استعمال کیا۔ حملے کے بعد بلوچستان حکومت نے کوئٹہ کے کاسی قبرستان میں کئی نامعلوم لاشیں مشتبہ انداز میں دفن کر دیں۔ کچھ لاشیں سول ہسپتال کوئٹہ کے مردہ خانے میں رکھی گئیں، مگر کسی کو رسائی نہیں دی گئی۔ اس سے لاپتہ افراد کے خاندانوں میں خوف و ہراس پھیل گیا کہ شاید ان کے پیارے ان لاشوں میں شامل ہوں۔

ریاست ماضی میں بھی مسلح حملوں کو ماورائے عدالت قتل چھپانے کے لیے استعمال کرتی رہی ہے۔ جبری طور پر لاپتہ افراد کو خفیہ حراستی مراکز سے نکال کر قتل کیا جاتا ہے اور بعد میں انہیں "مقابلے میں مارا گیا دہشت گرد" ظاہر کیا جاتا ہے۔ کئی بار اصل مسلح افراد کی لاشوں کے ساتھ لاپتہ افراد کی لاشیں رکھ کر تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک ساتھ مارے گئے۔ ہمارے پاس ایسے کئی کیسز کے شواہد موجود ہیں۔ اسی خوف کے تحت لاپتہ افراد کے خاندان روزانہ سول ہسپتال جاتے

رہے اور لاشوں کی شناخت کا مطالبہ کرتے رہے۔ مگر ریاست نے ان پُرامن مطالبات کے جواب میں انہیں تشدد اور مزید جبری گمشدگیوں کا نشانہ بنایا۔ بی وائی سی ان خاندانوں کے ساتھ کھڑی ہوئی اور ان کی آواز بلند کی۔ نتیجتاً ہمارے رہنماؤں اور کارکنوں کو شدید ریاستی جبر کا سامنا کرنا پڑا۔

20 مارچ کو صبح 5 بجے ہمارے ساتھی بیبگر بلوچ کو ان کے گھر سے گرفتار کیا گیا۔ جب ہم نے اس کے خلاف پُرامن احتجاج کیا تو ریاست نے براہِ راست فائرنگ کی، جس میں تین افراد جن میں ایک کم عمر بچہ بھی شامل تھا جاں بحق ہوئے اور درجنوں زخمی ہوئے۔ ہم نے مقتولین کی لاشوں کے ساتھ پُرامن دھرنا دیا، اور اسی دوران مجھے اور بیبو بلوچ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم بلوچستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کر رہے ہیں۔ ریاست ہماری آواز کو دبانے اور ہماری ساکھ کو نقصان پہنچانے کے لیے بے بنیاد الزامات لگا رہی ہے تاکہ بلوچستان کے وسائل کے استحصال اور عوام پر جبر کو بلا روک ٹوک جاری رکھا جا سکے۔

ہزاران رحیم داد: اسلامک اسٹیٹ خراسان کی موجودگی اور اس کی جانب سے دی گئی دھمکیوں کے بعد، بی وائی سی کس طرح اس صورتحال سے نمٹنے کا ارادہ رکھتی ہے؟

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ: جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، اسلامک اسٹیٹ اور پاکستانی فوج کے ترجمان ایک ہی زبان استعمال کر رہے ہیں۔ دونوں ہمیں غیر ملکی ایجنٹ کہتے ہیں، دونوں ہمیں ختم کرنے کی بات کرتے ہیں، اور دونوں ہماری ترقی پسند جدوجہد سے خوفزدہ ہیں۔ پہلے مجھے گرفتار کیا گیا۔ پھر آئی ایس پی آر نے مسلسل پریس کانفرنسوں کے ذریعے کردار کشی کی۔ ہمارے خلاف جھوٹا بیانیہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ ہمارے ساتھیوں کے خاندانوں کو اجتماعی سزا دی گئی۔ 300 سے زائد کارکنوں کو حراست میں لیا گیا۔ ہماری سیاسی سرگرمیوں پر غیر اعلانیہ پابندی عائد کی گئی۔ قانون کو ہمارے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا گیا۔ اس سب کے باوجود ہم نے خاموشی اختیار نہیں کی۔ قید، تشدد، میڈیا ٹرائل اور جھوٹے الزامات کے باوجود ہم اپنی پُرامن

جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جب ہماری استقامت واضح ہو گئی تو داعش ہمارے خلاف متحرک ہوئی اور ہمیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دیں۔ مگر ہم پرعزم ہیں کہ بلوچستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر خاموش نہیں رہیں گے۔ ہماری مانگیں سادہ اور قانونی ہیں بلوچ نسل کشی کا فوری خاتمہ، بلوچ عوام کو اپنی حقوق کی فراہمی، اور بلوچ عوام کو اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے کا حق شامل ہے۔

ہزاران رحیم داد: پاکستان میں حالیہ برسوں میں سیاسی اختلاف رائے پر کریک ڈاؤن میں اضافہ ہوا ہے، جس سے مختلف نظریاتی تحریکیں متاثر ہوئی ہیں۔ اس تناظر میں آپ بی وائی سی کا مستقبل کیسے دیکھتی ہیں؟

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ: ابتدا سے ہی بی وائی سی نے پاکستان کے اندر تمام مظلوم اور ریاستی جبر کا شکار قومیتوں اور طبقات کو متحد کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ وہ انسانی حقوق اور عوامی حقوق کے حصول کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں۔ آج پاکستان میں اکثریتی سیاسی قیادت جیلوں میں ہے، پُرامن سیاست کو مجرمانہ بنا دیا گیا ہے، اختلافی آوازیں دبائی جا رہی ہیں، میڈیا مکمل طور پر کنٹرول میں ہے، اور عدلیہ کو بھی متنازع آئینی ترامیم کے ذریعے متاثر کیا جا رہا ہے۔ عملاً پاکستان میں ایک مکمل آمرانہ نظام نافذ ہے۔ اس صورتحال میں ضروری ہے کہ تمام مظلوم قومیں اور طبقات متحد ہو کر اس آمریت کے خلاف مشترکہ جدوجہد کریں۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کا مکمل انٹرویو: دی گارڈین میں شائع ہونے والی گفتگو کا غیر مطبوعہ تفصیلی متن

24 مارچ 2026

ادارتی نوٹ:

یہ اس تفصیلی انٹرویو کا مکمل اور غیر سنسر شدہ متن ہے جس کے چند اقتباسات حال ہی میں معروف برطانوی اخبار "دی گارڈین" میں شائع ہوئے تھے۔ اس مکمل انٹرویو میں بلوچ یکجہتی کمیٹی (BYC) کی آرگنائزر ڈاکٹر ماہ رنگ نے اپنی گرفتاری، جیل کی قیدِ تنہائی، ریاستی جبر اور بلوچ قوم کی پرامن سیاسی مزاحمت کے حوالے سے اپنے تجربات اور خیالات کا تفصیلی اظہار کیا ہے۔

سوال: آپ ہمیں بتا سکتی ہیں کہ ان سوالات کا جواب دیتے وقت آپ کہاں بیٹھی ہیں؟ میرے لیے اس جگہ کی منظر کشی کریں ۔

جواب: اس وقت رات کے 9 بجے ہیں، اور میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں۔ ہماری گرفتاری سے لے کر آج تک ہمیں باقی خواتین قیدیوں سے الگ، جیل کے بلاک نمبر نو (9) میں رکھا گیا ہے۔

اسی بلاک نمبر 9 میں میرے ساتھ میری ساتھی بیبو بلوچ اور گلزادی بلوچ بھی ہیں۔ اس پورے بلاک میں کل 9 الگ الگ سنگل سیل (تنہائی کی کوٹھریاں، جن میں ایک وقت میں بس ایک ہی انسان رہ سکتا ہے) ہیں۔ ہر سنگل سیل میں اتنی ہی جگہ ہے جس میں ایک بندہ رہ سکے، اور ایک کموڈ ہے۔

جیل کے دوسرے قیدیوں سے ہمیں الگ رکھا گیا ہے۔ ہمارے احتجاج کرنے پر بھی ہمارے سیل تبدیل نہیں کیے گئے۔ مارچ 2025ء میں ہماری قید کے بعد، ہمیں چوبیس گھنٹے اور ہفتے کے ساتوں دن علیحدہ سنگل سیل میں رکھا گیا، جو کہ جیل مینوئل کے خلاف تھا۔ اس حکم کے خلاف جانے پر آئی جی جیل خانہ جات کو اپنی نوکری چھوڑنی پڑی۔

جیل میں شروعات کے چند مہینوں کے بعد ہم نے اپنا ایک معمول بنا لیا ہے، جہاں ہم ہر دن ایک ہی وقت میں اٹھتے ہیں۔ ہمارا زیادہ تر وقت سیاسی مطالعے میں لگ جاتا ہے؛ اس کے بعد ہم ہفتہ وار اسٹڈی سرکل کا انعقاد بھی کرتے ہیں۔ ہم دنیا سے ایک دن پیچھے چل رہے ہیں، کیونکہ ہمیں ایک دن پرانا اخبار ملتا ہے۔

سوال: اپنی جیل کی کوٹھری کے بارے میں بتائیں، وہاں کا کھانا کیسا ہے، اور واش روم کی سہولیات کیسی ہیں؟

جواب: جب ہمیں 22 مارچ 2025ء کو گرفتار کیا گیا، تو ہمیں جیل کی باقی خواتین قیدیوں سے الگ تھلگ رکھا گیا۔ ہمارے جیل کے بلاک کا نمبر نو (9) ہے۔ اس بلاک کو بیس سال قبل ہائی پروفائل (High Profile) قیدیوں کے لیے بنایا گیا تھا، جس میں لشکرِ جھنگوی اور ٹی ٹی پی کے ممبران کو بطور قیدی رکھا گیا تھا۔

ہماری جیل کی کوٹھری کا سائز 2 میٹر ہے، جہاں عام حالات میں ایک قیدی مشکل سے سو سکتا ہے۔ سیل کے ایک کونے میں کموڈ لگایا گیا ہے۔ یہ سیل عام قیدیوں کی بیرک کے مقابلے میں الگ ہے، اور اسے ٹارچر سیل کی طرز پر بنایا گیا ہے، جہاں عام قیدیوں کو سزا کی صورت میں قیدِ تنہائی میں رکھا جاتا ہے۔

اس پورے بلاک میں بی وائی سی (BYC) کی خواتین قیدی ہیں، جن میں میرے ساتھ بیبو بلوچ اور گلزادی بلوچ شامل ہیں۔ ہمیں جیل کے دوسرے قیدیوں سے الگ رکھنے کا مقصد ہمیں تنہا کرنا، اور ذہنی حوالے سے ٹارچر کرنا ہے۔ جہاں جیل کے ہر بلاک میں، ہر مہینے میں دو بار ججز کا دورہ

ہوتا ہے، وہاں ہمارے بلاک میں ایسا کوئی دورہ نہیں ہوتا۔ اس سال متعدد بار مجھ سمیت میری ساتھیوں کی طبیعت خراب رہی۔ مکمل علاج کے بجائے ہمارے بنیادی مطالبات کو مسترد کر دیا گیا، جس کی وجہ سے اپنا علاج خود کرنا پڑا۔

سوال: جیل میں آپ کو کون سے کام یا مشقت کرنی پڑتی ہے اور جیل کی کون سی چیز آپ کو خوفزدہ کرتی ہے؛ چوہے، لال بیگ، دوسری خواتین، یا جیل کے محافظ اور ان کا رویہ؟

جواب: جیل کے اندر تمام کام ہم خود کرتے ہیں۔ ہمارے سیاسی قیدی ہونے کی وجہ سے جیل انتظامیہ کی کوشش رہی ہے کہ ہمیں دوسرے قیدیوں کے ساتھ بات چیت کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ جیل میں ہمارے کورٹ کیس کے شفٹ ہونے کے باوجود، پیشی کو ہفتے کے دن رکھا گیا، جس دن پوری جیل بند رہتی ہے۔

ہم مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں کہ جیل میں موجود تمام قیدیوں کی بنیادی ضروریات اور حقوق انہیں مہیا کیے جائیں، جس کے سبب ہم جیل انتظامیہ کے ساتھ مسلسل میٹنگز بھی کر چکے ہیں۔ اپنی قوم کی اذیتوں، تکالیف اور مصائب کو مدِنظر رکھتے ہوئے، جیل نے ہمیں کبھی خوفزدہ نہیں کیا۔

سوال: کیا آپ کو کتابوں، ٹی وی، فون کالز، گھر کے پکے ہوئے کھانے، اور اپنے کپڑوں اور بستر تک رسائی حاصل ہے؟

جواب: شروع کے دنوں میں ہمیں اخبار پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر اپریل 2025ء میں ہم نے ایک ہفتے تک بھوک ہڑتال کی، جس کے بعد ہمیں کتابیں اور روزانہ دو اخبار پڑھنے کی اجازت ملی۔ اس کے علاوہ ٹی وی کا کنکشن نہیں دیا گیا، جس کی وجہ سے ہم روزانہ خبریں نہیں دیکھ سکتے۔

فون کالز پر سختی سے پابندی ہے۔ جیل مینوئل کے حساب سے ہر قیدی کو ہفتے میں دو فون کالز کی اجازت ہے، جس میں وہ اپنے وکلاء اور فیملی ممبران کو فون کر سکتا ہے، مگر ایک سال سے ہمیں یہ بنیادی حق نہیں دیا گیا۔

سوال: مشکل دنوں میں آپ کو کس چیز سے ہمت اور طاقت ملتی ہے؟

جواب: میری طاقت ہمارے لوگوں کی اپنے پیاروں کے لیے جدوجہد ہے۔ میں جب بھی بلوچ نسل کشی میں تیزی سے مایوس ہوتی ہوں، تو اگلے ہی لمحے میرے سامنے بلوچ ماں کا چہرہ آتا ہے۔ ہمارا حوصلہ ہمارے لوگوں کے انصاف کے لیے جدوجہد ہے، اور اس سے بڑا حوصلہ یہ جیل اور اس کی دیواریں ہیں، جہاں ہر لمحہ ہم اپنی قوم کے ان بے گناہ بیٹوں اور بیٹیوں کو یاد کرتے ہیں جو پاکستانی ٹارچر سیلوں میں غیر انسانی تشدد سے گزر رہے ہیں۔ ہماری امید بلوچ قوم کا وہ بھروسہ ہے، جسے ریاست اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کرنے کے باوجود توڑ نہ سکی۔

آج بھی بلوچستان کے دور دراز علاقوں سے لوگ ہم سے ملنے جیل آتے ہیں، جنہیں ہفتوں تک جیل انتظامیہ کے ہاتھوں تذلیل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہم سے ملاقات کے پانچ منٹ کے دوران وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا دشمن تمام تر طاقت کے باوجود کمزور ہے۔ تو یہی لمحے ہمارے حوصلے اور طاقت کو مزید بڑھاتے ہیں۔ تب یہ احساس مزید گہرا ہوتا ہے کہ اگرچہ قومی شعور اور جدوجہد کو جرم بنا کر مجھے قید کیا گیا ہے، مگر یہ قید عارضی ہے، اور ایک دن اسی عزم کے ساتھ دوبارہ اپنی تحریک اور قوم کے درمیان لوٹنا ہے۔

سوال: قید کی زندگی گزارنے کی وجہ سے یقیناً آپ کو غور و فکر کرنے کا کافی وقت ملا ہوگا؟ کیا اس نے آپ کو بدلا ہے؟ آپ خود کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

جواب: اپنے حقوق کی جدوجہد کی پاداش میں غیر قانونی حراست، اور کسی کی شخصی آزادی کو سلب کرنا ایک غیر فطری عمل ہے۔ ریاستی جبر نے ہمیشہ مظلوم اقوام کی ذہن سازی کی ہے،

میں نے ریاستی ہر جبر کو اپنی زندگی کے ایک سبق کے طور پر یاد کیا ہے، جس نے مجھے مزید ہمت دی ہے۔ اسی طرح جیل نے میری سیاسی تربیت میں ایک یونیورسٹی کا کردار ادا کیا۔

آج اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جبری گمشدگیوں کا شکار افراد کس غیر انسانی تشدد کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ جدوجہد وسائل، انسانی حقوق سے بڑھ کر ان تمام قوتوں کے خلاف ہے جنہوں نے ہماری قوم سے ہماری انسانیت چھین لی۔ میری گرفتاری کی رات لاشوں کے ساتھ ہمیں گرفتار کیا گیا۔ وہ لوگ جو پرامن سیاست پر یقین رکھتے تھے انہیں مارا گیا۔ اور یہ احساس ہی میری طاقت بنی رہی ہے کہ یہ جدوجہد کسی فرد کی نہیں بلکہ بلوچ قوم کے ساتھ دہائیوں سے جاری ناروا سلوک کے خلاف ہے اور یہ انصاف کی جدوجہد ہے۔

سوال: سلاخوں کے پیچھے جانے سے پہلے کی زندگی کی وہ کون سی چیز ہے جس کی آپ کو سب سے زیادہ کمی محسوس ہوتی ہے؟

جواب: کسی بھی انسان کی زندگی اس وقت مکمل ہوتی ہے جب وہ اپنی زندگی کا مقصد جان لے۔ مقصد کے بغیر زندگی کے کوئی معنی نہیں۔ میری زندگی کا مقصد بلوچ خاندانوں کی خوشحالی اور انصاف کی فراہمی کی جدوجہد ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے والد کی دی گئی سیاسی تربیت پر عمل کر سکی۔ اگر اس کی پاداش میں مجھے جیل کیا گیا ہے تو یہ مجھے اور مستحکم بنا چکی ہے۔

مجھے اپنے اس خاندان کی یاد آتی ہے جو میں نے اپنے سیاسی سفر کے دوران بنایا تھا۔ لاپتہ افراد کی مائیں، سائرہ، ماہ زیب، اماں زرگل، ادیبہ، معصومہ، یہی میرا خاندان ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے بلوچستان کے پہاڑوں اور خوبصورت سرزمین کی یاد آتی ہے۔

سوال: کیا کچھ ایسی یادیں ہیں جو آپ کو جینے کا حوصلہ دیتی ہیں؟ کیا آپ ان واضح ترین یادوں کا ذکر کر سکتی ہیں جو آپ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں؟

جواب: جیل میں انسان کا حافظہ تیز ہو جاتا ہے، اور زندگی کے تمام گزرے لمحے آپ کے سامنے آتے ہیں۔ میری یادوں کا مرکز ہمیشہ میری گل زمین بلوچستان رہی ہے۔

دوسرا مرکز یہی رہتا ہے کہ کیا ہمارے لوگوں کو پرامن زندگی جینے کا کوئی حق ہے؟ اور میرے والد کے ساتھ گزارے ہوئے تمام لمحات میرے چہرے پر ایک مسکراہٹ لاتے ہیں۔ اور ہمارے دھرنوں میں شریک ان بہادر بلوچ خواتین کی کہانیاں، ان کی جدوجہد مجھے حوصلہ دیتی ہیں، جہاں وہ میری تلخ یادوں کا حصہ ہیں وہاں وہ مجھے اطمینان اور ہمت دیتی ہیں کہ تمام تر مشکلات، اجتماعی سزا، ریاستی جبر، کے باوجود بلوچ قوم پرامن مزاحمت کا حصہ ہے۔

سوال: آپ جیل کے اندر اپنے وقار اور عزتِ نفس کو کیسے برقرار رکھتی ہیں؟

جواب: 22 مارچ 2025 کو ہماری گرفتاری کے بعد سے مختلف طریقوں سے ہمیں توڑنے کی کوشش کی گئی۔ ہماری ساتھی بیبو بلوچ پر پشین جیل منتقلی کے دوران تشدد کیا گیا۔ بیبرگ بلوچ سیل کے ناقص حالات کے سبب Urethral stricture (پیشاب کی نالی سکڑنے کے عارضے) میں مبتلا ہوئے۔ ان تمام حالات کے باوجود ہم اپنے بنیادی حقوق سے دستبردار نہیں ہوئے، اس کی بنیادی وجہ ہماری سیاسی تربیت اور نظریہ ہے۔

سوال: اب آپ کے نزدیک امید کے کیا معنی ہیں؟

جواب: ریاستی جبر اور تشدد کے سامنے ہماری امید ہمارے لوگوں کی اپنی سرزمین کے لیے محبت ہے، کہ وہ تمام تر مشکل حالات کا سامنا کر رہے ہیں مگر وہ اخلاقی زوال کا شکار نہیں ہوئے۔ ہمارے عوام ہی ہماری امید ہیں۔

سوال: پچھلے ایک سال کے دوران آپ نے جس قانونی عمل کا سامنا کیا ہے، اسے آپ کیسے بیان کریں گی؟ کھلی عدالت کے بجائے جیل کے اندر سماعت ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اب تک کتنی سماعتیں باہر اور کتنی اندر ہوئی ہیں؟

جواب: ایک سال کے تحویلی عرصے میں، پہلے تین (3) مہینے تک ہمیں 3-MPO کے تحت قید کیا گیا۔ اس کے بعد پورے بلوچستان میں ہمارے خلاف بوگس کیسز بنائے گئے۔ اس وقت تک آٹھ (8) پیشیاں ہماری سول لائنز پولیس اسٹیشن کوئٹہ میں ہماری حراست کے دوران رکھی گئیں، جہاں ہمیں تین (3) ماہ تک جسمانی ریمانڈ میں رکھا گیا، اور اکیس (21) پیشیاں ہڈہ جیل میں رکھی گئیں۔ جہاں ہم جیل ٹرائل کے خلاف تھے؛ جیل ٹرائل ہمارے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے، جو شفاف ٹرائل (Fair Trial) کے اصولوں کے خلاف ہے۔ جیل ٹرائل رکھنے کا مقصد میڈیا اور سول سوسائٹی کو ہمارے کیسز سے دور رکھنے کی کوشش تھی۔ اس ایک سال میں بوگس کیسز کے ذریعے ہماری قید و بند کو طویل کیا جا رہا ہے۔ ہماری ضمانتوں کی درخواستوں کو رد کیا گیا۔ اسی طرح بلوچستان ہائی کورٹ بھی بلوچ یکجہتی کمیٹی کے رہنماؤں کے کیسز کے حوالے سے جانبدار رہی ہے، اور انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہی ہے۔

7 فروری 2026ء کو ہم نے اینٹی ٹیررازم کورٹ کے جج کے خلاف عدم اعتماد کی درخواست جمع کروائی، جس کی بنیاد جج محمد علی مبین کی جانبداری تھی۔ مگر ہماری اس درخواست پر اب تک کوئی پیشرفت نہیں کی گئی، جو کہ انصاف کی فراہمی میں تاخیر کے مترادف ہے۔

سوال: قیدِ تنہائی کا تجربہ ہونے کے بعد، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ نے اس تنہائی کے دوران اپنی ذہنی استقامت کیسے برقرار رکھی؟ طویل تنہائی کسی انسان پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے؟

جواب: ہماری قید کے دوران، یہی ایک سال سے ہمیں تنہائی میں رکھا گیا ہے، جس میں ہم نظر بند قیدیوں کی طرح قید ہیں۔ ہماری فیملی اور وکلاء کے علاوہ کسی فرد کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں، جو کہ کسی بھی قیدی کے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ اس دوران کتاب ہی واحد ذریعہ تھی، جس نے ہمیں ذہنی دباؤ سے بچائے رکھا۔ اور ہم نے جیل کے اندر ایک مؤثر روٹین بنائی، جس سے ہمیں کافی مدد ملی۔

سوال: آپ کی عمر کتنی ہے؟ کیا آپ ورزش کا کوئی معمول اپناتی ہیں؟ کیا حراست نے آپ کی جسمانی صحت کو متاثر کیا ہے؟ کیا ضرورت پڑنے پر آپ کو طبی معائنے کی سہولت مل سکی ہے؟

جواب: اس سال جیل میں مجھے 31 سال پورے ہو چکے ہیں۔ شروعات کے دنوں سے میں نے سیاسی تعلیم، اخبار بینی، اور ورزش کو اپنا روز کا معمول بنائے رکھا، جہاں صبح و شام ایک ایک گھنٹے کا ورزش کا وقت ہوتا۔ مگر دورانِ حراست، اکتوبر سے مجھے کمر میں شدید درد اور جوڑوں میں تکلیف کی شکایت ہوئی۔ اس پورے عرصے میں ہمیں بروقت میڈیکل چیک اپ کی سہولت نہیں دی گئی۔

میں نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا Symptomatic treatment (صرف بیماری کی علامات کے مطابق علاج) کیا۔ میری بیماری کے بعد مجھے اپنا علاج خود کرنے پر مجبور کیا گیا؛ مسلسل ڈاکٹر اور چیک اپ کی درخواست دینے کے باوجود، ہماری درخواستوں پر عمل نہیں کیا گیا۔ بالآخر 18 فروری 2026ء کو میری طبیعت زیادہ خراب ہوئی، جس کے بعد مجھے ہسپتال لے جایا گیا اور وہاں پورے ہسپتال کو خالی کیا گیا۔ اس مختصر دورانیے میں میرے دو ٹیسٹ کیے گئے، جن میں مجھے "Lumbar Disc Herniation" اور "Radiculopathy" کے عارضے کی تشخیص ہوئی (یعنی ریڑھ کی ہڈی میں اعصاب کا دب جانا یا بُری طرح متاثر ہونا)۔

سوال: آپ کی حراست نے آپ کے خاندان کو کس طرح متاثر کیا ہے؟

جواب: میرے خاندان کو مسلسل میری سیاسی ایکٹویزم کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا۔ اس سے پہلے میرے کزن سلال بلوچ کو جبری گمشدگی کا نشانہ بنایا گیا،12 مارچ 2026 کو میرے 19 سالہ کزن سیف اللہ بلوچ کو جبری گمشدگی کا نشانہ بنایا گیا جو تاحال لاپتہ ہیں۔ اس کے علاوہ میرے اکلوتے بھائی کا نام فورتھ شیڈول میں ڈالا گیا، جسے مسلسل CTD کی جانب سے حراساں کیا جا رہا ہے۔ میری بہن کو میری اور تمام ساتھیوں کی رہائی کے لیے مختلف پریس کانفرنسوں

میں حراساں کیا جاتا ہے، اور میری بہنوں پر مختلف واقعات کے بنا پر ایف آئی آرز (FIRs) بھی درج کئے گئیں۔ ان تمام حربوں کا مقصد ہمیں کمزور کرنا، اور سیاسی جدوجہد کو چھوڑنے پر مجبور کرنا ہے۔

سوال: آپ ان لوگوں سے کیا کہیں گی جو پرامن احتجاج کو ایک خطرہ سمجھتے ہیں؟

جواب: میں سمجھتی ہوں، پرامن سیاست جمہوری ریاستوں کا سب سے بڑا عنصر ہے، جہاں عوام اپنی آزادیِ اظہار کو عمل میں لا کر اپنے بنیادی حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ان تحریکوں پر بزورِ طاقت کریک ڈاؤن کرنے کے بجائے، جمہوری ریاستیں ایسی تحریکوں کے مطالبات پر عمل کرتی ہیں، اور انہیں سیاست کرنے کی آزادی دی جاتی ہے۔

وہ ریاستیں جو اپنی تمام تر قوت و طاقت انسانی حقوق کی تنظیموں اور پُرامن سیاسی تنظیموں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں لگاتی ہیں، وہ کمزور ریاستیں ہیں، جو مسائل کے حل کے بجائے مسائل کو مزید پیچیدہ بناتی ہیں۔ یہ تمام عوامل ریاست کو مزید کمزور بناتے ہیں۔ اس کے باوجود عوام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ پرامن سیاسی جدوجہد کو جاری رکھیں۔ مزاحمت ہی ہمیں حقوق اور انصاف دلا سکتی ہے۔

سوال: آپ کیا امید کرتی ہیں کہ پاکستان سے باہر کے لوگ بلوچ مسئلے کے بارے میں کیا سمجھیں؟

جواب: میں سمجھتی ہوں آج کے گلوبل ورلڈ میں دنیا کے تمام باشعور عوام بلوچستان جیسے علاقے میں ہونے والے مظالم سے باخبر ہیں۔ ہمیں زیادہ توجہ کی ضرورت ہے کہ دنیا بلوچستان میں جاری نسل کشی کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔

سوال: ان تمام خطرات کے باوجود کون سی چیز آپ کو اپنے مقصد سے وابستہ رکھتی ہے؟

جواب: ریاستی جبر کے سبب بلوچستان کا ایک بھی گھر محفوظ نہیں۔ لاپتہ افراد کو فیک انکاؤنٹرز میں مارا جا رہا ہے اور لاپتہ افراد کے لواحقین کو ٹارگٹ کلنگ کے ذریع مارا جا رہا ہے،

جبری گمشدگی مردوں تک محدود نہیں رہی، بلکہ بلوچ عورتیں بھی اس کا شکار ہیں۔ بلوچ طالب علم ماہ جبین بلوچ اور ہیر نساء بلوچ، جبری گمشدہ خواتین میں شامل ہیں۔ 2025ء میں بی وائی سی کی رپورٹ کے مطابق 1223 افراد کو جبری گمشدگی کا شکار بنایا گیا۔ یہ وہ حقائق ہیں جو میڈیا میں موجود ہیں، ان حالات میں جدوجہد ناگزیر ہو چکی ہے۔ آج کے حالات ہم سے یہ توقع کرتے ہیں کہ ہم اپنی جدوجہد کو آگے لے جائیں۔ کیونکہ اب یہ چند افراد اور خاندانوں کا مسئلہ نہیں، بلکہ پوری ایک قوم کی بقا کا مسئلہ ہے؛ یہی سوچ ہمیں پرعزم اور وابستہ رکھے ہوئے ہے۔

سوال: مسلح گروہوں سے منسوب بلوچستان میں حالیہ فروری کے پرتشدد واقعات کے تناظر میں، آپ عسکریت پسندوں کی کارروائیوں اور پرامن سیاسی تحریکوں کے درمیان تعلق کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

جواب: بلوچستان میں مسلح تنظیموں کے وجود اور ان کی سرگرمیاں سب کے سامنے ہیں۔ ان کے وجود سے انکار کے بجائے ان تمام عوامل اور پالیسیوں پر نظر ثانی کی جائے، جس کی وجہ سے بلوچ نوجوان مسلح تنظیموں کا حصہ بن رہے ہیں۔

اس کے علاوہ سیاسی تنظیموں اور مسلح تنظیموں کے درمیان تعلق قائم کرنا ریاستی پروپیگنڈا ہے۔ سیاسی تنظیمیں، جس میں، میں بی وائی سی پر بات کروں گی، ہم پاکستان کے آئین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے قومی اور انسانی حقوق کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

سوال: حالیہ مہینوں میں آپ پر کئی الزامات اور قانونی مقدمات درج کیے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے شاید صرف سرخیاں دیکھی ہوں، کیا آپ وضاحت کر سکتی ہیں کہ وہ الزامات کیا ہیں اور آپ کیوں سمجھتی ہیں کہ وہ بے بنیاد ہیں؟

جواب: بلوچ یکجہتی کمیٹی پورے بلوچستان کی مؤثر آواز اور عوامی تحریک ہے، مگر ریاستی اداروں نے بی وائی سی کو ہمیشہ ایک تھریٹ (Threat) کے طور پر دیکھا ہے۔ اس کی وجہ سے اسلام آباد میں ہمارے پرامن لانگ مارچ پر تشدد کیا گیا۔ راجی مچی میں پورے بلوچستان کو بند

کر کے پرامن مظاہرین پر گولیاں چلائی گئیں۔ مجھ سمیت میرے ساتھیوں پر پچاس سے زائد ایف آئی آرز درج کی گئیں۔ اس کا مقصد بی وائی سی کے خلاف منظم ریاستی پروپیگنڈا ہے، جس نے کبھی سیاسی قوت کو برداشت نہیں کیا۔ ان تمام تر الزامات کا مقصد بلوچستان میں جاری کریک ڈاؤن کو جواز بخشنا ہے۔ ایک سال گزرنے کے دوران ریاستی پروپیگنڈا ہر چار دن بعد ایک نئے الزام کے ساتھ بی وائی سی کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عوام ریاستی پروپیگنڈے پر یقین نہیں رکھتی، اور بی وائی سی سے جڑا ہر فرد اپنے بنیادی حقوق سے دستبردار نہیں ہوگا، کیونکہ بی وائی سی بلوچ عوام کی تحریک ہے۔ اس کی کوئی ممبرشپ نہیں؛ بلوچستان سے تعلق رکھنے والا ہر وہ فرد جو بلوچستان میں جاری انسانی حقوق کی جدوجہد کو ماننے والا ہے، وہ اس کا حصہ ہے، اس کا رکن ہے۔

سوال: بعض حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ آپ نے خود کو بلوچستان لبریشن آرمی جیسے گروہوں سے سختی کے ساتھ دور نہیں رکھا، خاص طور پر شہریوں پر حملوں کے بعد۔ جو لوگ ایسی سوچ رکھتے ہیں، آپ ان سے کیا کہیں گی؟

جواب: میں نے مسلسل بلوچستان میں جاری ہر طرح کے تشدد کی مذمت کی ہے، اور آج بھی ان تمام گروہوں کے تشدد کی مذمت کرتی ہوں جنہوں نے ہمیشہ عام عوام کا قتلِ عام کیا ہے۔ ہمارے اوپر یہ الزامات عوامی تحریک پر جاری کریک ڈاؤن کو جواز فراہم کرنے کے لیے ہیں۔ ہم خود بلوچستان میں جاری تشدد اور جبر کا شکار ہیں، مگر سب سے بڑا تشدد اور جبر، ریاستی تشدد اور جبر ہے، جس کی وجہ سے بلوچستان کے حالات یہاں تک پہنچے ہیں۔ ہم خود مظلوم ہیں۔ مظلوم سے مذمت کا مطالبہ اس پر دباؤ قائم کرنے کے مترادف ہے۔ بلوچستان میں ہر بار مسلح تنظیموں کے حملوں کے بعد، پرامن سیاسی تنظیموں پر ریاستی کریک ڈاؤن کیا گیا ہے، جس سے ریاست اپنی ناکامی کو چھپانا چاہتی ہے۔

جیل سے اپنے خاندان کے نام خط

میری پیاری بہنوں اور میرے اکلوتے بھائی ناصر جان،

مجھے احساس ہے کہ میں نے آپ سب کو کن مشکلات میں ڈال دیا ہے اور کم عمری میں ایک بار پھر آپ کو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ 2011 سے ہم سخت حالات کا سامنا کرتے آ رہے ہیں، مگر آج ہر بلوچ گھرانے کی یہی کہانی ہے۔ جب بھی آپ خود کو کمزور محسوس کریں، اپنے اردگرد نظر دوڑائیں۔میں جانتی ہوں کہ میں نے ہمیشہ آپ سب کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھی، یہ سوچ کر کہ یہ بوجھ کبھی آپ پر نہ آئے۔ مگر بلوچستان میں رہتے ہوئے ایسا ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیں۔جیل میں پہلی ملاقات کے دوران، میں نے پہلی بار خود کو آپ میں دیکھا، وہی بے چینی، وہی اضطراب، وہی ہر چیز کو درست کرنے کی بے تاب جدوجہد۔ یہی خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یہ بھی ہماری تقدیر میں لکھا ہے۔ یہی ہر بلوچ کی تقدیر ہے۔ میں یہ خط اپنی کوٹھڑی سے اس لیے لکھ رہی ہوں کیونکہ کچھ باتیں ایسی تھیں جو ملاقات کے دوران کہہ نہ سکی۔ یہ زندگی میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے، اور ابھی میں نے جیل کی کوٹھڑی سے اپنے بہن بھائیوں سے بات کرنے کا ہنر نہیں سیکھا۔ میں آپ کو حوصلہ دینا چاہتی تھی مگر الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اب میں وہ حوصلہ پا رہی ہوں، اور وقت کے ساتھ آپ بھی پا لیں گے۔ یاد کریں جب ہمارے والد شہید ہوئے تھے تو ہم سب نے کیسے ہمت پائی تھی۔

میری خواہش تھی کہ یتیم ہو کر بڑے ہونے کے باوجود آپ کی زندگیاں سکون اور خوشیوں سے بھری ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ آپ کو کبھی پولیس چھاپوں اور جیلوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یہ آزمائشیں مزاحمتی زندگی کی سخت ترین حقیقت ہیں۔ بلوچستان میں ہم اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے۔ یہ مشکل ہو سکتی ہے، مگر کبھی آسان نہیں۔

ہمارے والد نے اس وقت ہمارے لیے فیصلہ کر دیا تھا جب انہوں نے بلوچ قومی تحریک کے لیے خود کو وقف کیا۔ اور ان کے بعد ہم سب نے ان کے فلسفے کو اپنایا اور اس جدوجہد کا حصہ بنے۔ اب ان مشکل حالات میں آپ ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور ایک دوسرے کا سہارا بنیں۔

یاد رکھیں: اصل طاقت صرف جسمانی نہیں ہوتی بلکہ ذہنی اور نظریاتی بھی ہوتی ہے۔ خود کو ذہنی اور نظریاتی طور پر مضبوط بنائیں۔ ایک دوسرے کا سہارا بنیں۔ کبھی خود کو ٹوٹنے نہ دیں۔ اور ہمیشہ یاد رکھیں، آپ کی بہن کمزور نہیں ہے۔ کمزوری ہماری وراثت نہیں۔ یہ مضبوط رہنے، ثابت قدم رہنے اور اپنے بلوچ بہن بھائیوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ اللہ آپ سب کی حفاظت کرے۔ اللہ بلوچستان کی حفاظت کرے۔ مجھے معلوم نہیں جب میں یہ خط لکھ رہی ہوں تو عید کی صحیح تاریخ کیا ہے، مگر میں آپ سب اور اپنی قوم کو پیشگی عید مبارک کہتی ہوں۔

نیک تمناؤں کے ساتھ،

ماہ رنگ بلوچ

جیل کی کوٹھڑی سے تحریر کردہ

جمعرات، 27 مارچ 2025

جیل سے بی وائی سی کے کارکنان کے نام خط

میرے باشعور، باعمل اور بہادر ساتھیوں!

مجھے معلوم ہے کہ حق اور انصاف کی جدوجہد بہت مشکل اور کٹھن ہوتی ہے۔ اپنے حقوق اور انصاف کے لیے لڑنے کے لیے ہمیں پھولوں پر نہیں بلکہ کانٹوں پر چلنا ہوتا ہے، اور مجھے فخر ہے کہ آج میرے ساتھیوں نے مشکل اور سخت حالات کو خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے اور انتہائی بہادری کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں۔اس جیل کی تاریک دنیا میں، جہاں نہ دن کی خبر ہوتی ہے، نہ رات کی، اور نہ ہی باہر کی دنیا کی کوئی ہوا ہم تک پہنچتی ہے، وہاں جب مجھے یہ خبر ملی کہ ہماری گرفتاری کے بعد ہمارے ساتھی ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں ہوئے اور سخت و مشکل حالات کے باوجود بلوچستان بھر میں عوامی مزاحمتی تحریک کو منظم رکھے ہوئے ہیں، تو اس کال کوٹھری کی تاریکی بھی مجھے روشن محسوس ہونے لگی۔ مجھے اپنے مادرِ وطن بلوچستان کی تازہ ہوا کی خوشبو محسوس ہوئی اور میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ میرا تعلق ان باشعور، باعمل اور بہادر لوگوں سے ہے، جنہیں سر کٹوانا آتا ہے مگر جھکانا نہیں۔

میرے ہم وطنوں!

ہمیں اپنے حقوق اور انصاف کے حصول سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور نہ ہی ہمیں کمزور کر سکتی ہے۔ ہمیں ہر حال میں اپنے حقوق اور انصاف کے لیے اپنی پُرامن جدوجہد کو جاری رکھنا ہے، کیونکہ ہماری بقا اسی جدوجہد میں ہے اور خاموشی میں ہماری اجتماعی موت ہے۔ ہمیں اشتعال دلانے اور ہماری پُرامن جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لیے کئی ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں، مختلف سازشیں رچی جا رہی ہیں، لیکن ہمیں کسی بھی صورت اپنی جدوجہد سے پیچھے نہیں ہٹنا، بلکہ تمام تر مشکلات کے باوجود اسے جاری رکھنا ہے، کیونکہ یہ نہ صرف ہمارا حق

بلکہ ہمارا فرض بھی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ، میں آپ سب سے التجا کرتی ہوں کہ جبری گمشدگی کے شکار افراد کے خاندانوں کو کسی بھی صورت اکیلا نہ چھوڑیں۔ ان ماؤں، بہنوں، معصوم بچوں اور بزرگوں کا حوصلہ آپ لوگوں کو بننا ہے۔ ان کی ہر پکار پر لبیک کہنا ہے، انہیں غیروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا، بلکہ ان کی جدوجہد میں عملی طور پر شامل ہو کر ان کے لیے آواز بلند کرنی ہے۔

میرے مستقل مزاج ساتھیوں!

اس وقت مستقل مزاجی کا اصل مفہوم آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے! آپ ہی ہیں جو سخت ترین حالات میں نہ صرف اپنی پُرامن جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس عوامی تحریک کو مزید منظم بھی کر رہے ہیں۔ آپ کی جدوجہد اور قربانیوں نے اس تحریک کو مزید تقویت بخشی ہے۔ ہمیں اب نہ صرف اس جدوجہد کو جاری رکھنا ہے بلکہ اسے مزید منظم اور مضبوط بھی کرنا ہے۔ اس تحریک کی کامیابی ہمارے سیاسی شعور، مستقل مزاجی اور اخلاص سے وابستہ ہے، اور مجھے آپ پر مکمل بھروسا ہے کہ آپ اپنی بصیرت، استقامت اور اخلاص کے ذریعے اس جدوجہد کو کامیابی کی منزل تک پہنچائیں گے۔

میرے دوستوں!

آخر میں، میں آپ سے بس یہی التجا کرتی ہوں کہ ہمیں ہر حال میں صبر کا دامن تھامے رکھنا ہے۔ ہماری اصل طاقت ہمارا حوصلہ اور ہماری برداشت ہے۔ ہمیں اپنے حوصلے چلتن کے پہاڑوں کی مانند بلند رکھنے ہیں۔ ہمیں مایوسی کے سائے کو اپنے درمیان پنپنے نہیں دینا، غصے اور اشتعال کی جگہ شعور اور حکمت سے فیصلے لینے ہیں۔ ہمیں کمزور اور مایوس کرنے والوں سے مشورہ نہیں لینا چاہیے، اور ہمیں منافقوں اور انتشار پھیلانے والوں سے خود کو دور رکھنا ہے۔ہماری اصل طاقت ہماری اجتماعی سوچ اور اجتماعی جدوجہد ہے۔ ہماری طاقت ہماری قوم کا حوصلہ، ہماری

مثبت طرزِ فکر اور ہماری استقامت ہے۔ ہمیں ہر حال میں اپنی طاقت کو سنبھالنا ہے۔ یہ جیل، یہ زنجیریں، یہ لاٹھیاں اور بندوقیں ہمیں توڑ نہیں سکتیں۔

یہ میرا پختہ ایمان ہے

کامیابی ہماری ہوگی

جدوجہد زندہ باد

مزاحمت زندہ باد

بلوچ قوم زندہ باد

آپ سب سلامت رہیں۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ

ھدہ جیل، کوئٹہ

28مارچ 2025

عید کے روز بلوچ قوم کے نام خط

میرے نہ ٹوٹنے والے ہم وطنوں!

ہدہ جیل کے احاطہ نمبر 9 کے کوٹھی نمبر 5 سے آپ کی بہن ما ہ ر نگ اور بیبو کی طرف سے آپ سب کو غلامی کی ایک اور عید مبارک!

اس قید تنہائی میں تمام تر اذیتوں سے بڑھ کر ایک اذیت سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ بلوچستان کے حالات سے ہمیں لاعلم رکھا جا رہا ہے۔ ہمیں اس بات کا اندازہ ہے کہ پورا بلوچستان سراپا احتجاج ہے، لیکن ہمیں ان اجتماعات اور احتجاجات سے لاعلم رکھنے کے لیے ہمارے ہر بڑے عوامی اجتماع اور احتجاج کے بعد ہمیں دو دن پرانی اخبار دی جاتی ہے۔ ان اخباروں میں چھپی خبریں ہمیں پریشان اور پر امید کرتی ہیں۔ پریشانی میں اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب سمی دین کی گرفتاری کی خبر دیکھی، دھرنوں اور احتجاجی ریلیوں میں کریک ڈاؤن ہو، یا اخبار کے کسی کونے میں کسی بلوچ بھائی کی جبری گمشدگی کی خبر چھپی ہو۔ لیکن اس کے برعکس اُمید ہمیں یہ چیز دے رہی ہے کہ ہماری قوم آواز اٹھا رہی ہے، ہماری پوری قوم ڈٹی ہوئی ہے، مزاحمت کر رہی ہے۔ ریاستی تشدد اور طاقت کے بھرپور استعمال کے بعد بھی پورے بلوچستان میں احتجاجی مظاہرے ہو رہے ہیں اور بلوچ قوم، گروہ، قبیلہ اور پارٹی سے نکل کر قومی مزاحمتی تحریک کا حصہ بن رہے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آج ریاست اور اس کے تمام نام نہاد جمہوری ادارے ریاستی جھوٹے بیانیے کو لے کر ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ ریاست کے یہ تمام ادارے اور ان کے قوانین بلوچوں کو دہائیوں سے ان کے قومی و انسانی حقوق سے محروم رکھے ہوئے ہیں اور یہی ادارے اور قانون بلوچوں کی پُرامن سیاست پر بھی قدغن لگا رہے ہیں۔ کیونکہ بلوچ کا اپنے حق کے لیے

بولنا اس ریاست میں جرم اور سب سے بڑی دہشت گردی ہے اور اپنے بے لگام اداروں کے ہاتھوں بے گناہ بلوچوں کا قتل عام سب سے بڑی حب الوطنی ہے۔

ہماری ایک عمر گزری ہے اس خونخوار ریاست کے مظالم کو دیکھتے ہوئے۔ 1 جولائی 2011 کو جب میرے والد کی مسخ شدہ لاش ہمیں سونپی گئی تو اُس وقت کے مطابق وہ ہمارے لیے سب سے بڑا جبر تھا۔ مگر پھر دیکھا کہ یہ ریاست اس سے بھی بڑھ کر جبر کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ پھر بلوچوں کے ہر دوسرے گھر میں مسخ شدہ لاشیں لائی گئیں۔ ان کے گھر، ان کے گاؤں جلا دیے گئے۔ ان کو اپنے ہی زمین میں مہاجرین بنا دیا گیا۔ یہ جبر بھی کم محسوس ہوا تو ان کے معصوم بچوں کو ایف سی نے گولہ بارود سے اڑا دیا۔ 2021 میں ان معصوم بچوں کی لاشیں ہوشاپ کیچ سے کوئٹہ ریڈ زون میں لائی گئی تھیں، جنہیں ریاست کی فوج نے بم سے اڑایا تھا۔ ان بچوں کے قاتلوں کو ایک عدالت نے سزا دی، تو دوسرے بڑے عدالت نے اس سزا کو منسوخ کیا اور بلوچ عورتوں نے ان معصوم لاشوں کو کندھا دیا، ان کے جنازے شہداء بلوچستان کے قبرستان میں پڑھائے گئے۔ اس کے بعد 21 مارچ 2025 کی وہ رات تھی جب کوئٹہ میں پرامن مظاہرین پر گولیاں برسائی گئیں۔ 13 سالہ نعمت اللہ اور 20 سالہ حبیب اللہ کی لاشیں سر راہ پڑی تھیں۔ ہم لاشوں کے سرانے بیٹھے تھے اور حکومت وقت سے ان لاشوں کے لیے انصاف کا مطالبہ کر رہے تھے۔

شہید نعمت اللہ کے والد اور چچا زاد کو زبردستی لاشوں کو دفنانے کے لیے ضلعی انتظامیہ نے دھمکی دی، ان کے خاندان کے دو افراد پہلے سے ان کے تحویل میں تھے۔ ضلعی انتظامیہ نے ہمارے احتجاج پر حملہ کیا اور زبردستی لاشوں کو لے جانا چاہتے تھے حالانکہ ہم نے 3 گھنٹے پہلے ہی لاشوں کو عزت اور احترام کے ساتھ دفنانے کا اعلان کر دیا تھا لیکن ضلعی انتظامیہ بضد تھی کہ لاشیں ان کو دی جائیں۔ ہماری مزاحمت پر اسسٹنٹ کمشنر کوئٹہ چلا گیا اور چند منٹ بعد پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ واپس آیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ نعمت کے خاندان کو لاش کے ہمراہ ہم رخصت کریں گے، پولیس سے ہم خود بات کریں گے۔

مگر پولیس افسروں کے اصرار کے باوجود سول ڈریس میں ایجنسی کے اہلکاروں کے آرڈر پر لاشوں کو زبردستی کھینچا گیا۔ خواتین نے تابوت کو زبردستی جکڑا ہوا تھا اور ان پر پولیس اور ایجنسی کے اہلکار لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ اس کے بعد وہ حبیب کی لاش کو زبردستی اٹھانے آئے۔ اس کا ضعیف والد رو رو کر منتیں کرتا رہا۔ مجھ سمیت بیبو بلوچ اور ہمارے دیگر دوستوں نے تابوت کو جکڑ رکھا تھا مگر ہمیں زبردستی تابوت سے الگ کیا گیا۔

حبیب بلوچ ایک نہتا نوجوان تھا جو بی وائی سی کے مرکزی ساتھی بیگر بلوچ کی جبری گمشدگی کے خلاف ہونے والے احتجاجی دھرنے میں شرکت کرنے آیا تھا۔ اس کے خاندان کے مطابق اس نے آج تک تمام دھرنوں میں شرکت کی تھی۔ اس نہتے اور بے گناہ کو یقین تھا کہ ہم جدوجہد سے اپنے حقوق حاصل کریں گے۔ اس رات اس کی لاش بھی ایک ناکام اور بے رحم ریاست کے سامنے مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کی والدہ کو اطلاع دی گئی اور وہ سحری کے بعد اپنے بیٹے کے دیدار کے لیے آنے والی تھی اور ہمارے لیے یہ قیامت کا منظر تھا۔

پولیس اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں کے پرامن مظاہرین پر حملے کے دوران میں نے اے سی کوئٹہ کو دیکھا جو چند منٹ پہلے نعمت کے والد کو دھمکا رہا تھا کہ "جو ہم نے کہا ہے وہ کرو"۔ اس وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، وہ حواس باختہ تھا، اس کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ وہی اے سی طاقت کے نشے میں بلوچ عورتوں پر ڈنڈے برسانے کے حکم دے رہا تھا اور بار بار یہی کہہ رہا تھا "پکڑو ان حرام زادیوں کو"۔ میں نے اس رات ایک ایک پولیس افسر اور اسسٹنٹ کمشنر کوئٹہ کے تمام تاثرات کو غور سے دیکھا اور ان کے نفرت کو اپنے دل میں نقش کر لیا۔ یہ نفرت کے بیج جو بوئے جا رہے ہیں، اس میں آج شاید بلوچ مظلوم ہے، طاقت ان کے پاس نہیں ہے مگر یقین کریں، وہ دن ضرور آئے گا جب بلوچ اپنے قاتلوں کے غرور کو ختم ہوتے ہوئے دیکھے گی۔

اس رات مجھے، بیبو بلوچ، دو کمسن بچیوں اور حبیب بلوچ کے لواحقین کو گرفتار کیا گیا، ہمیں الگ کر دیا گیا اور حبیب بلوچ کے لواحقین کو ایجنسیوں کے حوالے کیا گیا جہاں انہیں زبردستی بیان ریکارڈ کروانے کے لیے مجبور کیا گیا۔

جبکہ اس کے علاوہ ہمارے ساتھی بیگر بلوچ کو چھ دن تک لاپتہ کیا گیا، جہاں اس پر ذہنی تشدد کیا گیا اور انہیں بی وائی سی کے خلاف بیان دینے پر مجبور کیا گیا۔ ایسے بہت سے بیانات پہلے بھی دیے گئے ہیں مگر اب ہماری جدوجہد اس مقام تک پہنچ چکی ہے جہاں ان دو سطروں کے بیانات سے کچھ فرق نہیں پڑنے والا ہے۔ آج بلوچ قوم آپ کے جبر کے چشم دید گواہ ہے، پوری بلوچ قوم آپ کی جبر اور ظلم کی "victim" ہے۔ جب 21 مارچ کی رات ہم لاشوں کے ہمراہ سریاب روڈ میں دھرنا دے رہے تھے، اس وقت بلوچستان حکومت کے نام نہاد ترجمان کا بیان آیا کہ "بی وائی سی نے احتجاج کے دوران کسی کی میتوں کو سڑک پر رکھ دیا"۔ چند پیسوں کے عوض اپنے ضمیر اور ایمان بیچنے والوں، وہ کسی کی میتیں نہیں بلکہ اس دھرتی کے کمسن فرزند تھے جنہیں آپ بے لگام بندوق برداروں نے قتل کیا تھا۔

اس وقت سریاب کے عوام، عورتیں، بچے ہمارے دھرنے میں شریک تھے۔ ان میں سے ہر شخص اس جبر کا گواہ ہے جب پورے دن اپنے فورسز کو سریاب کی گلیوں میں نہتے لوگوں پر فائر کرنے کے احکام کے ساتھ بھیجا گیا۔

آج بلوچ قوم کے قومی جدوجہد پر قدغن لگانے کے لیے اربوں اور کھربوں روپے خرچ کرکے بے ضمیر صحافیوں، بے ضمیر ٹی وی چینلز اور اخبارات کے مالکان کو خرید کر منظم طریقے سے ہمارے پُرامن تحریک کے خلاف ایک پوری پروپیگنڈہ فوج بنا کر جھوٹے ریاستی بیانیے کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ لیکن ان ستر سالوں میں ریاست اس معمولی چیز کو بھی سمجھنے سے قاصر ہے کہ جس قوم کے ہر گھر میں آپ نے ایک لاش بھیجی ہے، وہ قوم آپ کے میڈیا پروپیگنڈہ سے کیسے مرعوب ہو گی؟ بلوچ یکجہتی کمیٹی چند لوگوں کی نہیں بلکہ عام عوام کی تحریک ہے، اس پر

کریک ڈاؤن کرکے اس کی مرکزی ساتھوں کو گرفتار کرنے سے اور اس کے خلاف پوری پروپیگنڈہ فوج فعال کرنے سے آپ اس تحریک کو ناکام نہیں بلکہ زیادہ مضبوط کر رہے ہیں۔

آپ وسائل اور پیسے خرچ کرکے ریاستی بیانیہ کی تشریح کرکے پنجاب کے چند بے ضمیر دانشوروں اور صحافیوں (جن کی صحافت تحقیق اور سچائی کے بجائے ریاستی بیانیہ پر مبنی ہے) کو بلوچوں کے خلاف استعمال کرکے شاید پنجاب کے عوام کو فریب میں رکھ سکتے ہیں، مگر یقین کیجیے بلوچ عوام کو آپ دھوکہ نہیں دے سکتے۔ ہماری قوم کا ایک ایک فرد، ایک ایک گھر آپ کے مکروہ چہرے سے واقف ہے، آپ کی جبر اور بربریت سے واقف ہے۔ بلوچ قوم آپ کی دھوکہ دہی سے واقف ہے، آپ کی بلوچستان میں تاریخ دھوکہ، فریب اور جبر پر مبنی ہے۔ جس طرح 1959 میں آپ نے جب بلوچوں کے بزرگ لیڈر نوروز خان کو قرآن کے نام پر دھوکہ دیا، بلوچ قوم آج تک اس دھوکہ اور فریب کو نہیں بھول پائی ہے، تو یہ بلوچ قوم آپ کے آج کے جبر اور بربریت کو کیسے درگزر کرے گی؟

آج جب میں ریاست کی ایک پُرامن سیاسی تحریک کو ڈیل کرنے کی اپروچ کو دیکھتی ہوں تو میں حیران ہوتی ہوں کہ واقعی ایکیسویں صدی میں ریاستیں اس طرح ہوتی ہیں؟ کیا 21ویں صدی میں دنیا کی ریشنل ریاستیں پُرامن سیاسی تحریکوں کو سمجھنے اور ان کے ساتھ ڈائیلاگ کرنے کے بجائے اربوں روپوں خرچ کرکے پروپیگنڈہ فوج بناتی ہیں تاکہ اس پُرامن سیاست تحریک کے خلاف بیانیہ بنایا جائے؟ کیا اس ریاست کی ریشنلٹی اس قدر ختم ہو چکی ہے کہ ایک قوم کے ہر گھر کو زخمی کرنے، ہر گھر کو تکلیف اور اذیت دینے، ہر گھر کی عزت و نفس کو پامال کرنے کے بعد اس قوم کے عوامی تحریک کو چند بے ضمیر صحافیوں کے پروپیگنڈہ سے ختم کیا جا سکتا ہے؟ یقین کیجیے، اکیسویں صدی میں اس طرح ایک دکان کو بھی نہیں چلایا جاتا جیسا کہ یہ لوگ ایک ریاست چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بی وائی سی حالیہ عرصے میں بلوچ نسل کشی کے خلاف ایک منظم عوامی تحریک ہے، لیکن یہ نہ بلوچوں کی پہلی تحریک و تنظیم ہے، نہ یہ آخری تنظیم و تحریک ہے۔ اگر آپ کے ناکام ریاستی

ادارے اس نیت سے بلوچ یکجہتی کمیٹی پر کریک ڈاؤن کر رہے ہیں کہ اس کے بعد بلوچستان میں بلوچ عوام کی تحریک کو کمزور کیا جائے گا تو آپ اپنے آپ کو ایک فریب اور دھوکے میں رکھ رہے ہیں۔ بلوچ تحریک کا مرکز بلوچ عوام ہے اور قومی حقوق کے لیے قربان ہونے کا فلسفہ ہے۔ اس تحریک کی طاقت یہی ہے کہ یہ بلوچ عوام کی تحریک ہے۔

آپ کے ریاستی جبر کا ٹارگٹ بلا تفریق بلوچ عوام ہے اور بلوچ عوام گزشتہ سات دہائیوں سے آپ کے ظلم اور جبر کو برداشت کرتے آ رہے ہیں، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بلوچ قوم کبھی بھی آپ کے جبر کے خلاف ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں ہوئی ہے۔ 77 سالوں سے بلوچ قوم اس تحریک کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ آج میں آپ پر ایک چیز واضح کرنا چاہتی ہوں کہ تنظیمیں فقط اس تحریک کا جزو ہو سکتی ہیں مگر بذات خود تحریک نہیں ہیں، آپ تنظیم کو وقتی طور پر شاید دبا سکتے ہوں لیکن آپ ایک عوامی تحریک کسی بھی صورت دبا نہیں سکتے ہوں اور ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ریاست نے جتنے شدت سے بلوچ قومی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی ہے تو اس کے ردعمل میں تحریک زیادہ شدت سے ابھری ہے اور اس دفعہ یہ تحریک ماضی کے نسبت زیادہ منظم انداز میں ابھر رہی ہے۔

آج بلوچ قوم حوصلے کے ساتھ اس سخت گھڑی کا سامنا کرے گی، آپ کے جبر کے نظام کے ہر ہر زاویے کو ہم expose کرتے رہیں گے اور یہ بلوچ قومی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ 20 سال پہلے بلوچ قوم کے مردوں کو جیل میں ڈالا گیا، انہیں گمشدہ کر کے ان کی مسخ شدہ لاشیں پھینکی گئیں، مگر آج ان کی خواتین بھی آپ کے ظلم کے نظام کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بنے ہوئے ہیں۔ بلوچ تحریک ایک حقیقی عوامی تحریک ہے اور اپنے نیچر میں مکمل طور پر Indigenousہے، لیکن آپ اپنے ناکامیوں کو چھپانے کے لیے مسلسل اس پر بیرونی فنڈنگ کے الزامات لگاکر اس تحریک کو متنازعہ کرنے کی کوشش کرتے ہو، لیکن آج یہ تحریک اس خطے کی سب سے بڑی منظم عوامی تحریک ہے۔

آج آپ نے بلوچستان بھر میں 144 نافذ کرکے غیر اعلانیہ مارشل لاء نافذ کیا ہے، عدالتوں میں ریاستی ایجنسی اپنے دباؤ برقرار رکھے ہوئے ہیں، اختر مینگل پر قاتلانہ حملہ کروایا جاتا ہے۔ یہ تمام سطحی، بچگانہ اور زمینی حقائق کے برعکس فیصلے اس نام نہاد Apex Committee میں لیے گئے ہیں جہاں تمام جنگی منافعہ خور اور پیدا گیر بیٹھے ہوئے ہیں، جنہیں نہ بلوچ عوام کی نفسیات کے بارے میں کچھ معلوم ہے اور نہ ہی بلوچستان کے حقیقی حالات کے بارے میں کچھ اندازہ ہے، بس ایک پروپیگنڈہ فوج بنا کر مطمئن ہیں کہ ہم پروپیگنڈہ اور جھوٹے بیانیے بنا کر طاقت اور بندوق کے زور پر ہمیشہ بلوچستان پر حکمرانی کرتے رہیں گے۔ اور میڈیا میں بیٹھ کر بلوچستان میں آرام سے فوجی آپریشن کے لیے بیانیہ بنا رہے ہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ 1948 سے آج تک بلوچستان میں کب آپریشن نہیں ہوا؟ ابھی صرف گزشتہ تین مہینوں کے دوران بلوچستان سے 500 کے قریب افراد کو جبری گمشدہ کیا گیا اور تین درجن کے قریب افراد ماورائے عدالت قتل کیے گئے، اس کے علاوہ آپ کیسے آپریشن کر سکتے ہیں؟

آج پورا بلوچستان آپ کے اس جبر کے خلاف سراپا احتجاج ہے، بلوچستان کی سڑکیں پچھلے دس دنوں سے مکمل بند ہیں، اور بی وائی سی نے ہمیشہ بلوچ لاپتہ افراد کے لواحقین کے دھرنوں اور احتجاجی کالز کی حمایت کی، ان کے شانہ بشانہ کھڑی رہی۔ آج BYC پر ریاستی کریک ڈاؤن کا مقصد بلوچستان میں جاری بلوچ نسل کشی کے خلاف تحریک کو متاثر کرنا ہے لیکن ہمیں اس ریاستی جبر کے خلاف اس تحریک کو مزید منظم کرنا ہے اور ہمارے قومی فرض ہیں۔

اس عید ہم لاپتہ افراد کے لواحقین کے ساتھ پریس کلب میں موجود شرکت نہیں کر سکتے مگر ہم کوٹی نمبر 5 سے ایک خاموش احتجاج کر رہے ہیں، اپنے ان بھائیوں کے نام جو بلوچ شناخت کے بنا پر غیر انسانی تشدد کے شکار ہیں۔

میری خواہش تھی کہ وہ قید تنہائی جہاں میرے والد نے اپنے قید کے تین سال گزارے، میں اس قید تنہائی کو جی سکوں۔ جس لمحے ہدہ جیل کے دروازے میرے لیے کھولے گئے، مجھے اپنے سیاسی استاد کی ہنسی یاد آئی جو اکثر ملاقات کے وقت جالی کے اس پار سے نظر آتی۔ ایسا لگا جیسے

وہ میرا ہاتھ تھامنے خود آئے اور مجھے گاڑی سے نکالا۔ میں ریاست کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری قید کے لیے ہدہ جیل کا انتخاب کیا، یہ جگہ میری تکلیف کا مرکز تھی، یہاں کئی عیدیں میں نے اپنے والد کو ملاقات والے کمرے کے جالی کے اس پار دیکھا، اور یہ جگہ میرا حوصلہ کا سبب بھی بنے گی۔ میں ان دیواروں کو ہر دن چھو کر اپنے بہادر والد اور ان کے گمنام ساتھیوں کی قربانیوں کو محسوس کرتی ہوں، جنہوں نے ہمارے کل کے لیے اپنا آج قربان کیا۔

یہ میری زندگی کی خواہش تھی کہ میں اس جگہ جا سکوں جہاں میرے والد کو رکھا گیا، جہاں انہیں ٹارچر کیا گیا۔ میں اُس آخری لمحے کو جینا چاہتی تھی جو ان کا آخری لمحہ تھا۔ قید و بند، کسی سیاسی کارکن کو کمزور نہیں کر سکتے۔ ہم جب اس راستے پر قدم رکھتے ہیں تو ہمیں یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ راستہ وقتی طور پر ہم سمیت ہمارے خاندان کے لیے تکلیفیں بڑھائے گا، مگر مستقل بنیادوں پر یہ ہمارے خوشحال مستقبل کا باعث بنے گا۔

اس قید تنہائی میں آج بھی میرا دل ہر اس ماں کے لیے دھڑکتا ہے جو بلوچ لانگ مارچ میں میرے ساتھی تھی، جن کے بیٹے گمشدہ ہیں۔ میں اس عید ان کے ساتھ نہیں، وہ مجھ سمیت تمام ساتھیوں کے لیے پریشان ہیں، مگر یہ پریشانی اور دکھ کا دن نہیں، حوصلہ کا دن ہے۔ ہمارا دشمن جبر کے جتنے نئے دروازے کھول کر جس طرح ظلم اور جبر کا مظاہرہ کر رہا ہے، وہ ہمارے سرزمین پر انصاف اور امن کے دنوں کے قریب لے آ رہا ہے۔

آج مجھے یقین ہوگیا جب میرے والد نے کہا کہ مجھے تنگ کرنے کے لیے ریاست نے میری گمشدگی کے دوران مجھے ایک دن اخبار پر روٹی لپیٹ کر دی، اس اخبار میں نواب اکبر بگٹی کی شہادت کی خبر تھی، جس نے مجھے ایک عرصے تک پریشان اور بیمار رکھا۔ اس ٹارچر سیل میں ہر نئے آنے والے قیدی سے انہوں نے اپنے سیاسی ساتھوں کا احوال پوچھا، انہیں اپنے بچوں اور بیوی کی فکر نہیں تھی، اگر فکر تھی تو اپنی قوم کی۔ تو میرے ہم وطنوں، آج بھی ہر ساتھی جو یہاں قید میں ہے، انہیں صرف اپنے قوم کی فکر ہے۔ میں وکیل، جیل کے سپاہی، دربان سے بس

یہی پوچھتی ہوں کہ سمی، شاہ جی اور دوسرے ساتھیوں کا احوال دیں، اور میرے قوم کی ثابت قدمی ہی ہمارے ہر لاپتہ پیارے کا بدلہ اور اس کا حوصلہ ہے۔

یہ ریاست جس نے ہزاروں گھر اجاڑے، یہ تحریک ان اجاڑے گھروں کو بسانے کے لیے ہے۔ ریاست کے ہر جبر، جھوٹ کا سامنا ہم ہمت، حوصلہ اور منظم جد و جہد سے کرے گے، جو ہمیں توڑنا چاہتے ہیں، ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونا ہے۔ لاشیں گرانے والی ریاست کا سامنا حوصلہ مند بلوچ قوم سے ہے۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ

ہدہ جیل، کوئٹہ

31 مارچ 2025

ہمیں کیا کرنا ہے؟

میرے جرات مند ساتھیوں!

ہمارے لیے آج یہ سوال بہت اہم ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ آج، جس وقت میں یہ خط کال کوٹھریوں سے تحریر کر رہی ہوں، اس وقت ہماری تنظیم اور تحریک بدترین ریاستی مظالم کا سامنا کر رہی ہیں۔ ہمارے متعدد ساتھی جیلوں میں قید ہیں، اور جیل سے باہر ہماری تنظیم پر بدترین قدغنیں لگائی گئی ہیں۔ میرے نزدیک اہم سوال یا اہم مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم پر تشدد کا بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے، ہمیں گرفتار کیا جا رہا ہے یا ہم جیلوں میں قید ہیں، بلکہ میرے نزدیک اہم سوال یہ ہے کہ ہمیں بحیثیتِ تنظیم ان حالات میں کیا کرنا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ اگر ہم اس سوال پر غور و فکر کیے بغیر آگے بڑھنے کی کوشش کریں تو شاید ہم بحیثیتِ تنظیم آگے نہ جا سکیں۔

جب میں گرفتار ہوئی، میرے ساتھی گرفتار ہوئے، تنظیم پر بدترین جبر (کریک ڈاؤن) (ویسے دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم اس لفظ "کریک ڈاؤن" کا بھی غلط استعمال کر رہے ہیں، ہم پر کریک ڈاؤن نہیں ہو رہا بلکہ ہم کالونیل جبر کا سامنا کر رہے ہیں) کا آغاز ہوا ہے، تو اس صورتِ حال کا خاصا اندازہ تو ہمیں اور ہماری تنظیم کو پہلے سے تھا، لیکن پھر بھی ہمیں حالات کی گہرائی سے جستجو کرنے کی ضرورت ہے۔

میرے ساتھیوں

میرے نزدیک تشدد، گرفتاری، جیل یا ان کے ردِعمل میں بڑے پیمانے پر احتجاج نہ کرنا شکست کی علامت نہیں ہے، اور میں قطعی طور پر ایسی باتوں پر ذرہ برابر بھی یقین نہیں رکھتی ہوں۔ میرے نزدیک شکست، سیاسی اور فکری پسماندگی ہے۔ جب ہم سیاسی اور فکری طور پر پسماندہ ہو

جائیں یا کھوکھلے ہو جائیں، تو وہ دن ہماری شکست کا دن ہوگا۔ان حالات میں ہماری دیگر اہم ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہم بحیثیتِ سیاسی کارکن اپنے آپ کو سیاسی اور فکری پسماندگی سے کیسے محفوظ رکھیں گے۔ فکری پسماندگی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا سب سے اعلیٰ ذریعہ "تنظیم" ہے۔ لیکن صرف تنظیم کا ہونا ازخود کافی نہیں ہے،بلکہ تنظیم میں مرکزیت کے گرد ایک ترقی یافتہ سیاسی شعور کا موجود ہونا بھی ضروری ہے، جو پورے ایک نیٹ (جال) کی طرح یونٹ سے لے کر مرکز تک تمام کیڈرز اور ذیلی اداروں کو اس ترقی یافتہ سیاسی شعور سے لیس کرے۔

اگر ہم تنظیمی اور تحریکی ترقی چاہتے ہیں، اور اپنے آپ کو سیاسی پسماندگی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، تو اس وقت ہماری تمام تر توجہ ان امور پر مرکوز ہونی چاہیے۔ اس نکتہ سے انکار کسی بھی صورت ممکن نہیں ہے کہ اس وقت ہمارے پاس نہ صرف سیاسی شعور سے لیس تنظیم موجود ہے بلکہ عہدِ حاضر میں وہ منظم بھی ہے۔ لیکن اپنی موجودہ حیثیت پر مکمل طور پر مطمئن ہونا یا خوش فہمی کا شکار ہونا، اپنے آپ کو جمود کا شکار کرنے جیسا ہے۔ ہمیں کسی بھی صورت ترقی اور آگے بڑھنے کے سفر کو نہیں روکنا چاہیے، اور اس کے لیے ہمیں مسلسل محنت، غور و فکر، اور جستجو جیسے تخلیقی ماحول کو پروان چڑھانا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ بی وائی سی جیسی تنظیم کسی حادثے یا ایک مخصوص ایونٹ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ یہ مسلسل جدوجہد، غور و فکر، اور جستجو کی پیداوار ہے، اور اس کی کامیابی کے لیے بھی مسلسل جدوجہد، غور و فکر، اور جستجو ضروری ہے۔

میرے دوستوں،

ہمارے لیے ہر وقت تنظیم اعلیٰ اور اہم رہی ہے، اور اسے ہمیشہ اہم و اعلیٰ ہونا چاہیے، کیونکہ ہم جس جبر کے نظام کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں، اُسے ایک منظم تنظیم کے بغیر شکست دینا ناممکن ہے۔لہٰذا، اس وقت ہماری توجہ ایک منظم تنظیم پر ہونی چاہیے۔ہمیں کسی ایک لمحے کے لیے بھی اپنے جذبات کو عقل پر حاوی نہیں ہونے دینا ہے۔ہمیں کسی بھی ایسے نقطے سے دور

رہنا ہے جو ہماری تنظیم کی اجتماعی قوت کو کمزور کرے۔ہمیں بد سے بدترین صورتِ حال میں بھی منتشر نہیں ہونا ہے۔منظم رہنا ہماری مجبوری نہیں بلکہ ہماری طاقت ہے۔ہمیں ہر طرح کی صورتِ حال میں منظم رہنا ہے۔ہمارے ہر ایک کارکن کو اپنے نفسیات اور اعصاب پر مکمل اختیار ہونا چاہیے، اور کسی بھی دباؤ کی صورت میں ایسے عمل سے اجتناب برتنا چاہیے جس سے تنظیم اور اجتماعی مقصد متاثر ہو۔ معمولی سے معمولی فیصلہ لینے کے لیے بھی ہمیں حالاتِ حاضرہ کا مکمل ادراک ہونا ضروری ہے۔ہمیں سوشل میڈیا کی کج بحثی سے متاثر ہو کر کسی بھی صورت تنظیمی فیصلے نہیں لینے ہیں۔

کامیابی ہر حال میں ہماری ہے، بس ہمت، جرأت اور غور و فکر سے اس جدوجہد کو آگے لے جانا ہے۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ

ہدہ جیل، کوئٹہ

15 اپریل 2025

قید سے بلوچ نوجوانوں کے نام پیغام

میرے فکری ساتھیوں!

ان دیواروں کے اندر وقت سست پڑ جاتا ہے، مگر سوچ رکتی نہیں۔ میں تمہارے اندر اسی سوچ کی حفاظت اور اس کے آگے بڑھنے کی ذمہ داری دیکھتی ہوں۔ ہماری زمین کی تاریخ محض فتوحات یا شکستوں کا ریکارڈ نہیں، یہ ایک مستقل بیداری کی داستان ہے: کبھی کتاب سے جنم لینے والی، کبھی سوال سے پروان چڑھنے والی، اور کبھی ہر دور کی للکار سے پھوٹنے والی بیداری ہے۔ آج بلوچستان جھلس رہا ہے مگر تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کے لیے جدوجہد ناگزیر ہوتی ہے۔ ہماری حالیہ تحریک دراصل جبر کے نظام کے خلاف وہ لڑائی ہے جس کی بھاری ذمہ داری خاص طور پر تمہاری نسل پر ہے۔

ریاستی جبر، جبری گمشدگیاں اور محدود وسائل کے باوجود جب تم تعلیم حاصل کر رہے ہو تو یہ ہر بلوچ نوجوان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ قومی تحریک سے وابستہ ہو اور اپنی ذمہ داریاں نبھائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ علم صرف الفاظ یاد کرنے کا نام نہیں؛ علم وہ نظر ہے جو حقیقت کو پہچانے، سوال اٹھانے اور نظام کو پرکھنے کی طاقت دیتا ہے جبکہ زندہ قومیں تعلیم کو قومی ترقی کا ذرائع بناتی ہے، نہ کہ تعلیم محض ڈگری حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ آپ نوجوان فلسفہ پڑھو تاکہ سوال اٹھانے کا طریقہ سیکھو۔ سیاست پڑھو تاکہ سمجھ سکو کون تم پر حکمرانی کرتا ہے۔ تاریخ پڑھو تاکہ جان سکو واقعات کیسے تراشے جاتے ہیں، کس کی آواز لکھی جاتی ہے اور کس کی خاموشی تاریخ میں دفن کر دی جاتی ہے۔ ٹیکنالوجی اور سائنس سے ڈرو نہیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کو صرف روزگار کا ذریعہ نہیں بناؤ بلکہ انہیں بلوچ قومی بقاء اور قومی ترقی کا ذریعہ بناؤ۔

میرے نوجوانوں!

حوصلہ وہ چراغ ہے جو اندھیرے وقتوں میں راستہ دکھاتا ہے۔ ہمت وہ قوت ہے جو انسان کو ناممکن کو ممکن کرنے کی جرات دیتی ہے۔ یاد رکھو، جب دل میں یقین زندہ ہو تو زنجیریں بھی راستہ دے دیتی ہیں۔ تمہاری ہمت وہ دیوار ہے جس سے خوف ٹکرا کر واپس پلٹتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ قومیں تلوار سے نہیں، حوصلے سے زندہ رہتی ہیں۔ وہ نوجوان جو ظلم کے سائے میں بھی خواب دیکھنے کی ہمت رکھتا ہے، وہی تاریخ کا دھارا بدلتا ہے۔ تمہارا کام صرف پڑھنا یا احتجاج کرنا نہیں، تمہارا کام ہے امید کو زندہ رکھنا، کیونکہ ناامیدی کسی قوم کی سب سے بڑی شکست ہے۔

یاد رکھو، حوصلہ صرف نعرہ نہیں، ایک مسلسل عمل ہے۔ وہ تب بھی زندہ رہتا ہے جب سب دروازے بند ہوں، جب آوازیں دبادی جائیں، اور جب امید کی کرن مدھم ہو جائے۔ وہ نوجوان جو ان حالات میں بھی سچ پر ڈٹا رہے، وہی مزاحمت کا اصل سپاہی ہے۔

ہمت وہ نہیں کہ تم دشمن کے خلاف للکار دو، بلکہ ہمت یہ ہے کہ تم اپنی کمزوریوں، خوف، اور مایوسیوں کو شکست دو۔ وہ شخص جو خود پر قابو پا لیتا ہے، وہ پوری دنیا کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ہار صرف تب ہوتی ہے جب تم لڑنا چھوڑ دو، اور بلوچ نوجوان نے لڑنا کبھی نہیں چھوڑا۔

باشعور بلوچ نوجوانوں!

ہر دور میں سب سے بڑی مزاحمت سوچنے کی جرات رہی ہے۔ مظلوم قومیں جب سوال اٹھاتی ہیں تو دیواریں ہلتی ہیں۔ جب الفاظ کے معنی عوام خود طے کرتے ہیں تو شعور آزاد ہوتا ہے۔ جو ذہن سوچنے سے انکار کر دے وہ اپنی ہی قید بن جاتا ہے۔

اپنی سوچ کو بیدار رکھو، اس کی حفاظت کرو، اور اسے خوف یا لالچ میں فروخت نہ ہونے دو۔ زمینی غلامی سے خطرناک ذہنی غلامی ہے؛ اس غلامی سے نجات کے لیے علم کو عمل کے ساتھ جوڑنا

ضروری ہے۔ ذہنی آزادی کی راہ میں اپنی شناخت کو اپنی طاقت بناؤ، تمہاری مادری زبان، تمہاری ثقافت، تمہاری مزاحمت کا فلسفہ تمہارا سب سے مضبوط اظہار ہیں۔

مزاحمت کا مطلب ضبط، صبر اور انصاف کے ساتھ کھڑا رہنا ہے۔ اگر تم کسی بات کے خلاف ہو تو پہلے اس کے حقائق کو پوری دیانت سے سمجھو۔ اگر کسی کے حامی ہو تو اس کے ممکنہ نتائج قبول کرنے کا حوصلہ بھی رکھو۔ مزاحمت کا عظیم اصول تحمل ہے؛ جو ضبط رکھتا ہے وہ اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔

میرے کاروان کے دوستوں!

جب ماں کا بیٹا برسوں لاپتہ ہو، جب عورتیں جبری طور پر اٹھا لی جائیں، جب گاؤں خوف کی گرفت میں آ جائیں، اور جب بچوں کے خواب چھن جائیں، تو یہ معاملات صرف سیاسی نہیں رہتے بلکہ انسانیت کی شکست بن جاتے ہیں۔

کیا ہم اس شکست کو قبول کریں گے؟ نہیں! ہمارے شہیدوں کی قربانیاں بتاتی ہیں کہ ہماری قوم ظلم کے سامنے اپنی سر نہیں جھکا سکتی ہے۔ علم، عدل اور مضبوط آواز کے ذریعے اپنے لوگوں کی عزت بحال کرو۔ تمہاری جدوجہد کا مرکز نفرت نہیں بلکہ وقار ہو؛ تمہارا احتجاج شور نہیں بلکہ استقامت ہو۔ جب تم اپنا قلم، دلیل اور کردار مظلوم کے ساتھ کھڑا کرتے ہو تو تمہاری گواہی کسی عدالتی فیصلے سے کئی گنا طاقتور بن جاتی ہے

میرے بلوچ قوم!

اس میڈیا اور بیانیہ سازی کے دور میں ہر خبر ایک دعویٰ ہوتی ہے اور ہر تصویر ایک انتخاب۔ بیانیے کو پڑھنا سیکھو خبر کے ماخذ، زبان کے اشارے اور منظر کے چھپے ہوئے حصوں کو نوٹ کرو۔ جس بات کو سب کہہ رہے ہوں، اسے سب سے زیادہ پرکھو۔ ظالم اور مظلوم کے اس تصادم میں فتح و شکست طاقت کے توازن پر منحصر ہوتی ہے، مگر دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ مظلوم اقوام محدود وسائل کے باوجود بہادری دکھا کر تبدیلیاں لائی ہیں۔ ہماری مزاحمتی تحریک نے کئی بار ریاستی

بیانیے کو بے نقاب کیا ہے، یہ ہمارا فخر ہے اور ہماری امید بھی۔ اپنی صلاحیتوں کو قوم کی خدمت میں لگاؤ۔ جو میڈیکل کے طالب علم ہیں وہ اپنے لوگوں کا علاج کریں؛

جو کمپیوٹر سائنس کے طالب علم ہیں وہ اپنے علاقے کے بچوں کو انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس کی تعلیم دیں؛ جو ادب کے طالب علم ہیں وہ بزرگوں کی کہانیاں لکھیں تاکہ یادداشت مٹی میں دفن نہ ہو۔ یہ سب خدمت تمہاری مزاحمت ہے، کیونکہ یہی زندگی کو مضبوط بناتا ہے اور ظلم کا مقابلہ کرتی ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی زندگی کے لیے تین وعدے لکھو:

1. تم سچ کی تلاش کبھی نہیں چھوڑو گے۔
2. تم اپنی صلاحیتیں قوم کے کام میں لگاؤ گے، چاہے وہ قدم کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔
3. تم قومی زبان اور شناخت کے احترام کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بناؤ گے۔

میں قید میں ہوں مگر میری سوچ آزاد ہے۔ تم باہر ہو، اپنی سوچ کی آزادی کی حفاظت کرو۔ اپنے حلقوں میں علم کے چراغ جلاؤ، بحث کے دائرے قائم کرو، اپنی بولی میں کتابیں لکھو، اپنے آپ سے سوال کرو اور اپنے عمل سے جواب دو۔ یاد رکھو، حوصلہ وہ روشنی ہے جو قید کی دیواروں سے بھی باہر نکل جاتی ہے۔ یہی تمہارا سب سے بڑا فرض ہے، یہی تمہاری اصلی مزاحمت ہے۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

30 اکتوبر 2025

ماما قدیر کو قومی جدوجہد میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا

ماما قدیر بلوچ قومی تحریک کے ایک مثالی، ثابت قدم اور مستقل مزاج اثاثے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ میرے والد کو اپنی جبری گمشدگی کے دوران نواب اکبر بگٹی کی شہادت کی خبر ایک پرانے اخبار میں لپٹی ہوئی خشک روٹی کے ذریعے دی گئی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ خبر ان کے لیے ایک گہرا ذہنی صدمہ تھا۔ اسی طرح گزشتہ نو ماہ کے دوران ہمیں بھی جیل میں رہتے ہوئے بلوچستان میں مسلسل جبری گمشدگیوں اور ماورائے عدالت قتل کی خبریں سننے کو ملتی رہتی ہیں۔ ملاقات کے لیے آنے والے لوگوں سے میرا اکثر پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ کیا آج پھر کسی بے گناہ کو قتل کیا گیا ہے؟ میرے وطن کے کتنے نوجوان بیٹے و بیٹیاں اس بے رحم ریاست کے ہاتھوں لاپتہ کر دیے گئے ہیں؟

بیس دسمبر کو آنے والا اخبار میرے لیے ایک اور دکھ کی داستان لے کر آیا۔ اس دن بلوچ سیاسی کارکن بانک کریمہ کی پانچویں برسی تھی، اور میں گلزادی اور بیبو کے ساتھ کراچی سے تمپ تک ان کے جسدِ خاکی کے سفر کی صعوبتیں بیان کر رہی تھی کہ اسی دوران ہمیں ماما قدیر کی وفات کی خبر ملی۔

ماما قدیر بلوچ قومی تحریک کے ثابت قدم اور مستقل مزاج سیاسی کارکن تھے۔ انہوں نے سولہ برس تک بلوچ لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے مسلسل جدوجہد کی۔ ماما قدیر کی سرپرستی میں قائم لاپتہ افراد کے کیمپ نے مجھ سمیت بلوچستان کے ہر سیاسی کارکن کی ابتدائی سیاسی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کیمپ میں آویزاں تصاویر نے دو دہائیوں تک بلوچ نسل کشی کی ہولناک منظر کشی دنیا کے سامنے رکھی۔ ایک ایسے وقت میں جب پاکستانی میڈیا بلوچستان میں انسانی حقوق کی سنگین پامالیوں پر خاموش تھی اور ضمیر فروش سیاست دان نام نہاد ترقی کے جھوٹے بیانیے گھڑ رہے تھے، یہ کیمپ بلوچستان میں جاری ریاستی خونریزی کو بے نقاب کرتا رہا۔

جب بلوچ سرزمین لاشیں اُگل رہی تھی اور بلوچ حقوق کی جدوجہد کرنے والی تمام سیاسی تنظیموں کے رہنما یا تو جبری گمشدگی کا شکار ہو چکے تھے یا شہید کر دیے گئے تھے، ان شہداء میں ماما قدیر کے بیٹے جلیل ریکی بھی شامل تھے۔ مگر ماما نے اپنے بیٹے کی شہادت کے غم میں ڈوبنے کے بجائے اس کے ساتھیوں کی بازیابی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی۔ وہ ہر اس خاندان کے لیے حوصلے کی علامت بنے جنہوں نے ریاستی جبر کے باعث اپنے پیاروں کو کھو دیا تھا۔

میرے والد کہا کرتے تھے کہ جب کبھی میری قید پر دل افسردہ ہو تو ماما قدیر کے کیمپ میں لگی ان تصویروں کو دیکھنا۔ یہ تصویریں گواہی دیتی ہیں کہ لوگ برسوں سے لاپتہ ہیں۔ میرے والد کی شہادت کے بعد اسی کیمپ میں آویزاں تصاویر نے مجھے ایک مقصد دیا، ایک ایسی سمت عطا کی جس نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا۔

میں نے ماما قدیر کی غیر متزلزل استقامت کو قریب سے دیکھا۔ میں نے انہیں بابا خیر بخش مری کی وفات کے بعد ان کے بیٹے کے ساتھ بابا کے جسدِ خاکی کے حصول کے لیے لڑتے دیکھا۔ بلوچستان میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب بیشتر لواحقین خوف کے باعث خاموش تھے، ماما قدیر نے بلوچ لاپتہ بیٹوں کو فراموش نہیں کیا۔ انہوں نے ان کے کوائف اکٹھے کیے، ان کے نام اور تصاویر آویزاں کیں۔ جب ریاستی مشینری جبری گمشدگیوں سے انکار کر رہی تھی، ماما کے کیمپ نے ان تمام جھوٹے پروپیگنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

جب جبری گمشدگیوں میں تیزی آئی تو کیمپ میں ہر ماہ پوسٹر بدلے جانے لگے۔ یہ وہی کیمپ تھا جو ابتدا میں ذاکر مجید بلوچ، جلیل ریکی اور علی اصغر بنگلزئی جیسے چند سیاسی کارکنوں کی بازیابی کے لیے قائم کیا گیا تھا، اور بعد ازاں یہ بلوچستان کے تمام لاپتہ افراد کی بازیابی کی ایک توانا تحریک بن گئی۔ کیمپ کے چاروں اطراف ان بہادر نوجوانوں کی تصاویر آویزاں تھیں جنہیں پاکستانی فورسز نے لاپتہ کر دیا تھا۔

بعد ازاں، جب لاپتہ افراد کو ماورائے عدالت قتل کرنے کے واقعات میں اضافہ ہوا، تو کیمپ کی ایک دیوار پر "لاپتہ نوجوانوں کی تصاویر" کی جگہ "شہید نوجوانوں کی تصاویر" نے لے لی۔ بلوچ نسل کشی میں تیزی کے ساتھ، ماما قدیر نے نئے پوسٹر بنوانا کم کر دیے، اور اب وہ تصویروں کے ساتھ محض "رہا" یا "شہید" لکھ دیا کرتے تھے۔

ان سولہ برسوں میں ماما قدیر نے اپنی ذات کو مکمل طور پر اجتماعی جدوجہد کے ساتھ جوڑ دیا۔ تاہم جب بھی وہ کسی صحافی یا سیاسی کارکن سے بلوچ لاپتہ افراد کے مسئلے پر گفتگو کرتے تو اپنے شہید بیٹے جلیل ریکی کا ذکر کرتے وقت ان کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے۔ ان کی آنکھوں میں بیک وقت غم اور غصہ جھلکنے لگتا۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ میں جلیل کے بیٹے کو ساتھ لے کر اس کی قبر پر جاتا ہوں اور اسے بتاتا ہوں کہ اس کے والد کو ریاست نے بے رحم تشدد کے بعد قتل کیا، اور اس کے والد کا قاتل ریاست ہے، تاکہ وہ میرے بعد بلوچ قومی تحریک کا حصہ بن سکے۔

ماما قدیر بلوچ قومی تحریک کے ایک مثالی اور لازوال سیاسی کردار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان کی قربانی، حوصلہ اور مسلسل جدوجہد بلوچ قومی تحریک سے وابستہ تمام سیاسی کارکنوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ

ہدہ جیل، کوئٹہ

22دسمبر 2025

باب دوم: بیبرگ بلوچ

تعارف بیبرگ بلوچ

بیبرگ بلوچ 1987 میں قلات کے علاقے دشتِ گوران میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پلے بڑھے جس کی جڑیں گہری سیاسی شعور سے جڑی ہوئی تھیں۔ ان کے والد بلوچ اسٹوڈنس آرگنائزشن بی ایس او کے سر گرم رکن تھے کی انیس سو ستر کی دہائی، وہی دہائی جب بلوچستان اپنی تاریخ کی ایک بڑی سیاسی مزاحمت اور کشمکش سے گزر رہا تھا۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے سیاسی شعور بیبرگ کا ذاتی انتخاب نہیں بلکہ ایک ورثہ تھا، جو انہیں خاندانی یادداشت، اجتماعی دکھ اور اپنی قوم سے گہری محبت کے ذریعے ملا۔

بیبرگ بلوچ نے اپنی ابتدائی تعلیم اور کالج کوئٹہ میں مکمل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے بلوچستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی خضدار میں الیکٹریکل انجینئرنگ میں بیچلر آف انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ خضدار کا یہ سفر صرف تعلیمی مرحلہ نہیں تھا بلکہ ان کی سیاسی بیداری کا ایک اہم موڑ بھی ثابت ہوا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں انہوں نے منظم طلبہ سیاست میں قدم رکھا اور بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن میں شمولیت اختیار کی۔ انہوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز خضدار میں بی ایس او آزاد کے ڈپٹی یونٹ سیکریٹری کے طور پر کیا۔

اس دور میں وہ بلوچ طلبہ تحریک کی معروف شخصیات کے ساتھ کام کرتے رہے، جن میں بی ایس او آزاد کے نائب چیئرمین ذاکر مجید بلوچ بھی شامل تھے، جنہیں جون 2009 میں جبری طور پر لاپتہ کر دیا گیا۔ اسی طرح سنگت ثناء بلوچ، جو بعد میں جبری گمشدگی کا شکار ہوئے اور قتل کر

دیے گئے، اور دیگر کئی مخلص کارکن بھی اس تحریک کا حصہ تھے جنہوں نے بلوچستان میں طلبہ مزاحمت کی سیاسی فضا کو شکل دی۔

اسی سیاسی وابستگی اور سرگرمیوں کے باعث بیبرگ بلوچ کو خضدار میں پاکستانی سیکیورٹی فورسز نے جبری طور پر لاپتہ کر دیا۔ کچھ عرصے بعد انہیں رہا کر دیا گیا، مگر یہ تجربہ ان کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ تاہم اس نے ان کے حوصلے کو توڑنے کے بجائے مزید مضبوط کیا اور انہوں نے اپنے لوگوں کے حقوق کی جدوجہد جاری رکھنے کا عزم مزید پختہ کر لیا۔ ریاستی دباؤ اور دھمکیاں اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔

ان کی زندگی کا سب سے دردناک لمحہ 2 مارچ 2010 کو آیا، جب خضدار میں بلوچ کلچر ڈے کی تقریب کے دوران ریاستی خفیہ اداروں اور ڈیتھ اسکواڈ کے اہلکاروں نے دستی بم حملہ کیا۔ اس دھماکے کے نتیجے میں ان کی ریڑھ کی ہڈی شدید متاثر ہوئی اور وہ مستقل طور پر مفلوج ہو گئے، جس کے باعث انہیں زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا سہارا لینا پڑا۔

کئی سال تک دردناک طبی علاج اور بحالی کے مراحل سے گزرنے کے بعد بیبرگ نے اپنی تعلیم دوبارہ شروع کرنے کی بھرپور کوشش کی اور بی یو ای ٹی خضدار میں اپنی انجینئرنگ کی ڈگری مکمل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ تاہم خضدار کی اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے انہیں دوبارہ داخلہ دینے سے انکار کر دیا، انہیں شرپسند قرار دیا اور ان کا داخلہ باضابطہ طور پر منسوخ کر دیا۔

اس کے باوجود بیبرگ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی تعلیمی جدوجہد کا رخ بدلتے ہوئے بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں زولوجی میں ایم ایس سی میں داخلہ لیا اور اسے مکمل کیا۔ بعد ازاں انہوں نے اسی جامعہ میں ایم فل زولوجی پروگرام میں داخلہ حاصل کیا، مگر جب وہ تیسرے سمسٹر میں پہنچے تو ان کا داخلہ اچانک بغیر کسی وضاحت کے منسوخ کر دیا گیا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ بیبرگ بلوچ نے معذور افراد کے حقوق کے لیے کام کرنے والی سماجی تنظیموں کی سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ جبری گمشدگیوں کے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں بھی

شریک ہوتے رہے اور لاپتہ افراد کے خاندانوں کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے دھرنوں، ریلیوں اور پریس کلب کے احتجاجی اجتماعات میں مسلسل حاضررہتے تھے۔

بلوچ یکجہتی کمیٹی کے قیام کے بعد بیبگر بلوچ بی وائی سی کے سیاسی سفر کے جڑ گئے۔ ہر سیاسی پروگرام اور احتجاج میں بیبگر بلوچ سرگرم رہا ہے۔ اس کے بعد 2024 میں بلوچ یکجہتی کمیٹی کے مرکزی اسٹریکچر کے قیام کے بعد بیبگر بلوچ کو بطور مرکزی کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ بیبرگ بلوچ کو انسانی حقوق کے کئی اعزازات کے لیے نامزد بھی کیا گیا اور ان کی دہائیوں پر محیط پرامن جدوجہد اور قربانیوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا۔

اس سب کے باوجود دستی بم حملہ، مستقل معذوری، تعلیمی مواقع کی منسوخی، جبری گمشدگی اور برسوں پر محیط مسلسل سیاسی جدوجہد، پاکستانی ریاست کا ردعمل نہ تو اعتراف تھا اور نہ ہی انصاف، بلکہ ایک اور جبر کی صورت میں سامنے آیا۔بیبگر بلوچ کو کوئٹہ میں ان کے گھر سے بغیر کسی قانونی وارنٹ کے بئیس مارچ دوہزار پچیس کو پاکستان کے نام نہاد کاؤنٹر ٹیررازم ڈیپارٹمنٹ (سی ٹی ڈی)نے گرفتار کیا۔

بیبرگ بلوچ کی زندگی دراصل ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو مزاحمت میں پیدا ہوا، دکھ اور قربانیوں میں پروان چڑھا، ریاستی تشدد کے باعث معذور ہوا، ادارہ جاتی بزدلی کے سبب تعلیم سے محروم کیا گیا، مگر اس کے باوجود اس کی روح اور عزم کبھی نہیں ٹوٹا۔ وہیل چیئر تک محدود ہونے کے باوجود، اس دستی بم کے جسمانی اثرات کے ساتھ زندگی گزارنے اور غیر قانونی حراست میں مناسب طبی سہولیات سے محرومی کے باوجود، وہ آج بھی ہر اس معنی میں ثابت قدم کھڑے ہیں جو اہم ہے اور بلوچ عوام کی عزت، انصاف اور خوف سے آزاد زندگی کے بنیادی حق کی جدوجہد کی ایک ناقابلِ شکست علامت ہیں۔

بیانیے کی جنگ اور لاپتہ انسانوں کا المیہ

دنیا تیزی سے بدل رہی ہے، مگر طاقت کی بنیاد وہی بیانیہ ہے۔ آج عالمی طاقتیں یہ جان چکی ہیں کہ جنگیں صرف میزائلوں اور بندوقوں سے نہیں جیتی جاتیں بلکہ تصور کی دنیا میں تشکیل دیئے گئے اس بیانیے سے جیتی جاتی ہیں جو عوام کے شعور اور خوف کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ طاقتور ریاستوں کے لیے پروپیگنڈا محض ایک ذریعہ نہیں، ایک مستقل ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ اپنے ہر اقدام کو جواز فراہم کرتی ہیں۔

پاکستان کے حالات بھی اسی عالمی رجحان کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ یہاں سیاسی اختلاف کو دبانا، کمزور طبقات کی آواز پر پہرہ بٹھانا اور مظلوم قوموں کے خلاف طاقت کا استعمال ایک معمول بن چکا ہے۔ اس سب کے پیچھے وہ بیانیہ کارفرما ہے جسے ریاست اپنی ناکامیوں اور زیادتیوں کو چھپانے کے لیے دن رات تراشتی رہتی ہے۔ اگر بلوچستان پر نظر ڈالیں تو بیانیے اور حقیقت کے درمیان فاصلہ بہت واضح دکھائی دیتا ہے۔ حکومتی بیانات اکثر زمینی صورتحال سے میل نہیں کھاتے۔ ایک طرف طاقت اور تشدد کا مسلسل استعمال ہے، اور دوسری طرف ایسی پروپیگنڈا مہمات ہیں جن کا مقصد بلوچ عوام کی جدوجہد کو مشکوک اور بدنام کرنا ہے۔ یوں ایک طرف ظلم روا رکھا جا رہا ہے اور دوسری طرف اس ظلم کو مصنوعی بیانیوں میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ بلوچستان میں سب سے گمبھیر مسئلہ لاپتہ افراد کا ہے، ایک ایسا زخم جو نسلوں کو چاٹ رہا ہے۔ دہائیوں پر محیط یہ المیہ آج بھی تازہ ہے، بلکہ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوان، مزدور، طالب علم، یہاں تک کہ خواتین بھی اس اندھیر نگری کا شکار بن رہی ہیں۔ کوئی گھر ایسا نہیں جس نے خوف، بے بسی اور انتظار کی اذیت نہ چھپی ہو۔

ریاستی ادارے اس مسئلے کے وجود سے انکار کرتے آئے ہیں۔ کبھی اسے مبالغہ کہا جاتا ہے، کبھی متاثرین پر الزامات لگا کر حقیقت کو مسخ کیا جاتا ہے۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ لاپتہ افراد کا

مسئلہ انسانی حقوق کی شدید ترین خلاف ورزیوں میں شمار ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ریاستی سطح پر کئی بار غیر رسمی اعترافات سامنے آئے ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ یہ ظلم اور جبر ایک تلخ حقیقت ہے، اور اس کی جڑیں طاقت کے ایسے مراکز تک پھیلی ہوئی ہیں جو سیاسی اداروں سے بھی بالا دست ہیں۔ بلوچستان میں زمینی حالات محض رپورٹس کا حصہ نہیں بلکہ دل دہلا دینے والی انسانی کہانیاں ہیں۔ مائیں برسوں اپنے گمشدہ بیٹوں کی تصویریں اٹھائے سردی گرمی میں احتجاج کرتی ہیں۔ بوڑھے والدین عدالتوں اور کیمپوں کے چکر کاٹتے کاٹتے خود بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ کچھ خاندان معاشی طور پر ٹوٹ جاتے ہیں، کچھ ذہنی اذیت میں بکھر جاتے ہیں۔ کئی نوجوان جو محض اپنے پیاروں کی بازیابی کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ بھی اسی ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ کچھ کو تشدد کے بعد ان کی مسخ شدہ لاشوں کی صورت واپس کیا جاتا ہے۔ خواتین تک کو جبری طور پر لاپتہ کیا جارہا ہے اور ان کے خلاف مقدمات قائم کیے جارہے ہیں، اور ایسے قوانین استعمال کیے جا رہے ہیں جن کا مقصد صرف خوف اور خاموشی پیدا کرنا ہے۔

ریاست نے میڈیا پر پابندیاں لگا کر، سوشل میڈیا پر مصنوعی بیانیہ تشکیل دے کر، اربوں روپے خرچ کر کے اپنی حکمتِ عملی کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایک سوال اب بھی پوری شدت سے موجود ہے: کیا کوئی بیانیہ ایک ماں کے آنسوؤں کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ کیا ہزاروں گھرانوں کی چیخوں کو پروپیگنڈے کی مٹی میں دفن کیا جا سکتا ہے؟ سچائی کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے کہ اسے دبایا تو جا سکتا ہے، ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک اس ظلم کا اعتراف نہیں ہوتا، جب تک انصاف کی راہ ہموار نہیں کی جاتی، تب تک بیانیے کی جنگ تو شاید جیتی جائے، لیکن حقیقت کی جنگ ریاست ہمیشہ ہارتی رہے گی۔

بیبرگ بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

14دسمبر2025

مزاحمت اور بلوچ شیر ذال

آج چھ سال ہو گئے بھائی کو دیکھے ہوئے، اس سے بات کیے ہوئے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے اسکی آواز بھول گئی ہوں اور کبھی کبھی لگتا ہے جیسے روز مجھ سے بات کرتا ہے-آنگن میں بیٹھ کر ہلکی ہلکی بارش کو دیکھ کر دل نہ جانے کیوں اداس ہو رہا تھا۔ بارش کے چھوٹے چھوٹے قطرے جب پھولوں پر موتیوں کی طرح چمکتے ہیں تو بہت خوبصورت لگتے ہیں۔

پھولوں سے یاد آیا ایک دفعہ میں نے بھائی کو کہا، اگر پھولوں میں خوشبو نہ ہوتی تو کیا وہ اتنے ہی خوبصورت اور دلکش لگتے جتنے اب لگتے ہیں، تو اس نے فوراً ہنس کر کہا پاگل! اگر پھولوں میں خوشبو نہ ہو توکاغذ کے پھولوں کی طرح بے قدر ہو جائیں گے۔ کیا میں بھی اس پھول کی مانند ہوں جس میں کوئی خوشبو نہیں، کیا میری بھی کوئی قدر و قیمت نہیں؟ اگرکسی شہ کی قیمت نہیں تو کیا اسکا کوئی وجود ہے؟ اگر کسی کا وجود نہیں تو وہ کیسے زندہ ہے ؟ اور کیا میں زندہ ہوں؟

ابھی خیالوں کی بند دروازوں کے پیچھے جھانکنے والی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی اور اندھیروں کا سفر ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ چلو کوئی تو ہے جو زندہ ہونے کا احساس دلاتا ہے چاہے وہ شور ہی کیوں نہ ہو۔ موبائل کو خاموش کرتے ہوئے میں سوچنے لگی اگر کبھی شور اور خاموشی کا مقابلہ ہو تو کون جیتے گا؟ یقیناً شور جیت جائے گا ، نہیں خاموشی جیت جائے گی کیوں کہ خاموشی میں بہت گہرائی ہوتی ہے وہ شور کو آسانی سے اپنے اندر سما لے گی اور جیت جائے گی ۔ایک دفعہ پھر موبائل کی گھنٹی بجی اور شور خاموشی کو چیرتی ہوئی باہر آئی، اس طرح خاموشی ہار گئی موبائل کا اسکرین دیکھا تو احساس ہوا ارے کوئی کال نہیں بلکہ میرا اپنا رکھا ہوا الارم ہے جو بار بار شور مچا رہا ہے۔

آج بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی پتہ نہیں یہ ذہنی تھکاوٹ تھی یا جسمانی لیکن اپنے ہونے کا احساس بار بار دلا رہی تھی۔ نماز ادا کرنے کے لیے وضو کرنا تھا لیکن اچانک موسم بدل جانے کی وجہ سے سستی ہو رہی تھی۔ لیکن ہمت باند کر وضو کی اور نماز ادا کیا۔ جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا مانگوں یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا،کچھ دنوں سے جب بھی دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو دماغ سُن ہو جاتا ہے۔ میں کچھ مانگے بنا ہی اٹھ گئی۔ نماز ادا کر کے دعا نہ مانگنا بھی ایسے ہی ہے جسے کوئی مزدور پورا دن محنت مشقت کرے اور بنا معاوضہ لیے گھر کو چلے۔

آج پریس کلب جانا تھا اپنے بھائی کے لاپتہ ہونے کے 6 سال مکمل ہونے کے خلاف احتجاج کرنے۔پریس کلب جانا بھی کسی قیامت سے کم نہیں،جہاں کوئی ماں اپنے 16 سال سے لاپتہ بیٹے کو تلاش کرنے آتی ہے، تو کوئی بیٹی اپنے 17 سال سے لاپتہ باپ کے ملنے کی امید لے کر آتی ہے، اور اس جوان سالہ لڑکی کو کیسے بھول سکتی ہوں جو اپنے منگیتر کی تلاش میں ایک زندہ لاش کی مانند اپنی پتلی سی جسامت پر بہت بڑا بوجھ اٹھا کر بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھتی رہتی ہے،اس نے اپنی منگنی کے وقت کتنے خواب بنائے ہوں گے،ایک خوش حال زندگی کی، ایک اچھا ہمسفر کی جو زندگی بھر اسکا خیال رکھیں، اسکی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری کرے لیکن اب تو یہ سارے خواب بس اس کی آنکھوں میں کسی آرٹسٹ کے ان خشک رنگوں کی مانند سوکھ گئے تھے جو اب کبھی کام نہ آئینگے۔اس کے لاغر بدن اور خشک آنکھوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔اور مجھ سمیت کئی بہنیں اپنے بھائیوں کے ملنے کی امید میں وہاں موجود ہوتی ہیں۔ ماں تو بھائی کا انتظار کرتے کرتے بستر مرگ سے جا لگی ہے،اب تو بس لاچاری کے ساتھ صرف دعا مانگتے زندہ ہے۔کبھی کبھی سوچتی ہوں انسان اتنا مجبور کیسے ہو سکتا ہے،ایک ماں کیسے تڑپ تڑپ کر رو رو کر اپنے اس بیٹے کے لیے ہاتھ اٹھائے پوری رات دعا مانگتی ہے جس کے بارے میں اسے پتہ بھی نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا ان اندھیرے کال کوٹھڑیوں میں مزاحمت کرتے کرتے اس وطن کی مٹی میں گواڑخ کا بیج بو کر ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔اور

اس سے بھی درد ناک احساس یہ کہ ماں کو روتا تڑپتا دیکھنا اور بس بےبسی لاچاری میں کسی معجزہ یا قیامت کا انتظار کرنا۔

ابھی ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ حانی حانی کی آواز کانوں میں گونجنی لگی،میں سمجھ گئی میں نے کافی دیر کر دی اور میری دوست بولان زادی مجھے تلاش کر رہی ہے،مجھے پتہ تھا آج پھر اپنی دوست سے ڈانٹ پڑے گی اور وہی ہوا آتے ہی اس نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ سنا دیا اور میں اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ہم باتیں کرتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ اتنی خاموشی کیوں ہے،اور اتنا اندھیرا کیسے ہو سکتا ہے۔سانس لینے میں بہت دشواری پیش آرہی تھی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے۔کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں میں، ہاں خواب ہی تو ہے ورنہ دنیا میں ایسی کون سی جگہ ہے جہاں اتنی خاموشی اور اتنا اندھیرا ہو۔اس سے پہلے کہ میں کچھ فیصلہ کرتی مجھے دور سے کسی دروازے کے کھلنے کی آواز آئی لیکن یہ کوئی عام دروازہ نہیں بلکہ کوئی آہنی دروازہ لگ رہا تھا جس طرح کوئی بھاری بھرکم زنگ آلود دروازے کی چرچراہٹ ہو۔کسی کے قدموں کی آواز کانوں میں گونجنے لگی اور نزدیک سے نزدیک تر آ رہی تھی اور اچانک سے ایک مدھم سی روشنی ہوہی اپنے اردگرد کے مناظر دیکھنے کے بعد سانس لینا اور مشکل ہو گیا۔ اتنا چھوٹا کمرہ میں نے زندگی میں نہ تو کبھی دیکھا تھا نہ کبھی سوچا تھا۔ فرش اور دیواروں پر خون کے دبے ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی ذبح خانہ ہو۔ اتنی وحشت اور خوف زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ دروازہ کھلا ایک قد آور شخص زور سے بولا، لڑکی جلدی سے اٹھو صاحب نے بلایا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتی، بولتی میرے بازو سے پکڑ کر مجھے گھسیٹ تھے باہر لائے، میری آنکھوں پر ایک پٹی باندھی گئی اور کسی اور کمرے میں لے گے جہاں شاہد دو یا تین یا اس سے بھی زیادہ لوگ موجود تھے اور میرے پہنچتے ہی سوالات کا بوچھاڑ کر دیا گیا۔ میں ابھی تک اندازہ لگا رہی تھی کہ یہ کیسا خواب ہے، اتنے میں میرے گال پر کسی نے ایک زور دار تھپڑ رسید کیا اور مختلف سوال پوچھتا رہا جن کا مجھ سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا۔ پھر آواز کے ساتھ تشدد میں بھی شدت آتی

گئی۔ ابھی میں کچھ سمجھنے اور بولنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ کسی نے گالی دیتے ہوئے کہا یہ اپنے بھائی کی طرح ڈیٹ ہے ایسے نہیں مانے گی بند کر دو اسے۔

بھائی!؟ ہاں یاد آیا میں تو اپنے بھائی کے لاپتہ ہونے پر احتجاج کر رہی تھی، اچانک گولیوں کی آواز اور آنسو گیس کی شیلنگ شروع ہو گئی۔ آنسو گیس کی شیلنگ کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے بادل زمین پر اتر آئے ہوں، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا بس اتنا یاد ہے سفید کپڑوں میں ملبوس لوگ لاٹھیوں سے سب کو مار رہے تھے، اور بولان زادی جو بوڑھی ماوں کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتی میرے سر پر بہت زور سے کچھ لگا اور جب آنکھ کھلی تو خود کو یہاں پایا۔ کہاں ہوں میں؟کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں آج تک میرے ہزاروں بلوچ بھائی بے رحم تشدد سہتے رہے ہیں۔کیا یہ وہی خون کے دبے ہیں جن سے وطن ذادوں کی خوشبو آرہی ہے؟ کیا میرے بھائی کا خون بھی اس میں شامل ہے۔ کیسے پہچان کروں، بھائی تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں نا، ان چھ سالوں میں خود کو اپنے بھائی سے اتنے قریب کبھی نہیں پایا جتنا آج محسوس کر رہی ہو، کیا اس فرضی قربت کی قیمت بہت ذیادہ نہیں۔ روشنی ایک دفعہ پھر سے اندھیرے میں تبدیل ہو گئی اور شور پھر سے خاموشی میں بدل گئی، خاموشی بالآخر جیت گئی۔ نہ بھوک کا احساس تھا نہ نیند آ رہی تھی۔ دن اور رات میں فرق کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ ایک دفعہ پھر دروازہ کھلا اور مجھے کچھ لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا، آواز مختلف لیکن سوال وہی پرانے جن کا میرے ساتھ کوئی جواب نہیں۔ تشدد کا ایک نہ روکنے والا سلسلہ شروع ہوا جو شاہد میرے بیہوش ہونے پر خاتم ہوا ہوگا۔ اب یہ روز کا معمول بن چکا تھا، مجھے افسران کے سامنے پیش کیا جاتا اور مختلف طریقوں سے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اور میں ہمیشہ کی طرح رو رو کر کہتی کہ میں نے کچھ نہیں کیا مجھے چھوڑ دو لیکن میری ایک نہ سنی جاتی۔

اور پھر وہ دن بھی آیا جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔دوران تفتیش ایک افسر نے کہا اگر آج تم نے سارے الزامات اپنے سر نہ لیے تو تمہارے کپڑے اتار دیے جائیں گے، یہ سنتے ہی جسم میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ایک ہاتھ

میری طرف بڑھا اور میری چادر میرے سر سے اتار دیا گیا۔ وہ چادر جس کی حفاظت صدیوں سے میری روایات نے کی تھی، وہ چادر جس کی حفاظت کے لیے ہزاروں سر قربان ہو گئے، وہ چادر جس کی خاطر راسکو، چلتن اور کابوہی کے پہاڑ بھی سر کٹانے کو تیار ہو جائے، وہ چادر جس کے لیے ملک ناز نے اپنی جان گنوانے میں ذرا برابر دیر نہ کی۔ اور پھر مجھے ایسی حالت میں لایا گیا جس سے مجھے خود سے نفرت ہونے لگی۔ کاش میں یہ سب دیکھنے سے پہلے مر جاتی، کاش میں پیدا ہی نہیں ہوتی، میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اور وسوسے جنم لے رہے تھے۔اچانک میرے ذہن میں وہ بنگالی عورتیں آئی جنوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اپنی شناخت حاصل کر لی۔ اور بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ اگر بنگالی اپنے عورتوں کے لیے ظالم سے لڑ سکتے ہیں تو بلوچ تو وہ غیرت مند قوم ہے جو اپنی عورتوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرے گی اور ایک ایک ظلم کا جواب دینا ہو گا۔

اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ شاید میں اپنے منزل تک نہ پہنچ سکوں لیکن میری قربانی اس راستے کو ضرور روشن کرے گی جس کی وجہ سے میرے ہم وطن منزل پر پہنچ کر اپنی شناخت حاصل کر لینگے۔ یہ درندگی برداشت کرتے مجھے چھ ماہ گزر گئے۔اب میں بھی اس پھول کی مانند ہوں جس میں کوئی خوشبو نہیں، کیا میری کوئی قدر و قیمت نہیں؟ اگرکسی شےکی قیمت نہیں تو کیا اسکا کوئی وجود ہے؟ اگر کسی کا وجود نہیں تو وہ زندہ کیسے ہے اور کیا میں زندہ ہوں؟ ہاں میں زندہ ہوں اپنے قوم کے ہر اس نوجوان کے دل میں جس نے ایک روشن مستقبل کے خواب دیکھے ہیں، میں زندہ ہوں ہر اس ماں کی امید میں جو کبھی کم نہیں ہوئی، میں زندہ ہوں اس سرزمین کی مٹی میں جو اتنے ظلم دیکھنے کے باوجود ہر سال خوبصورت رنگ برنگے گواڑخ جنم دیتی ہے۔

بیبرگ بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

11جنوری2026

مزاحمت نے ہمیں چنا ہے۔

بلوچستان ایک ایسا نام ہے جو دو بالکل مختلف دنیاؤں کو ایک ہی لفظ میں سمیٹ لیتا ہے۔ استعماری نظروں کے لیے یہ سرزمین صرف ایک نقشہ ہے۔ زیرِ زمین دولت سے بھرا، معدنیات سے لدا، اور جغرافیائی اہمیت سے مالا مال۔ یہ قوتیں بلوچستان کو اپنی طاقت کا ایندھن سمجھتی ہیں، ایک ایسی کان جسے کھودتے رہو اور جن کی روحیں اس زمین پر آباد ہیں، انہیں بھول جاؤ۔ لیکن جو اس سرزمین کے باسی ہیں، ان کے لیے بلوچستان کا نام کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ ان کے لیے یہ نام مسخ شدہ لاشوں کی تصویر ہے، لاپتہ افراد کی فہرستیں ہیں، بے روزگاری کا درد ہے، اور ایک ایسا نظام ہے جو انہیں ان کی ہی زمین پر اجنبی ثابت کرتا رہتا ہے۔ جب بھی کوئی بلوچ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کرتا ہے تو ریاست کے پاس اسے خاموش کرنے کے کئی ہتھیار ہیں، لاپتہ کر دو، ماورائے عدالت قتل کر دو، یا غدار کا لیبل لگا کر سلاخوں کے پیچھے پھینک دو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ بلوچستان کی روز کی کہانی ہے۔ اور آج میں اس کہانی میں ایک اور باب کا اضافہ کرنے جا رہا ہوں، اپنا باب۔

رمضان کا مہینہ تھا، ۲۰ مارچ ۲۰۲۵ کی سحری کا وقت تھا اور گھر میں ایک خاص قسم کی خوشی چھائی ہوئی تھی۔ صبح نو بجے میرے والد اور ہمشیرہ عمرے کی سعادت حاصل کر کے کوئٹہ واپس آ رہے تھے۔ گھر والوں کے ساتھ باتیں ہو رہی تھیں، انتظار میں ایک پُرجوش بے تابی تھی۔ سحری کے بعد میں نے نماز کی نیت باندھی ہی تھی کہ مین گیٹ پر بے رحمانہ دستک پڑی۔ اس سے پہلے کہ کوئی دروازہ کھولتا، دروازہ توڑ دیا گیا۔ سی ٹی ڈی، پولیس اور سادہ کپڑوں میں ملبوس اہلکار ہجوم کی صورت گھر میں داخل ہو گئے اور تلاشی لینے لگے۔ میں نے نماز ادھوری چھوڑی اور جلدی سے اپنی وہیل چیئر پر بیٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ انہوں نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو فوری طور پر گرفتار کر لیا۔ میں بار بار پوچھتا رہا کیوں؟ کس جرم میں؟ لیکن جواب نہ ملا،

صرف خاموشی اور وردیوں کا تکبر۔ جب گھر والوں نے احتجاج کیا تو انہیں تشدد سے خاموش کرایا گیا۔ نہ بلوچی روایت کا احترام، نہ اسلامی اقدار کا لحاظ نہ عورتوں کا، نہ بچوں کا، نہ بزرگوں کا۔ چادر اور چاردیواری کا تقدس جسے بلوچ ثقافت کی روح کہا جاتا ہے، ایک بار پھر پیروں تلے روند دیا گیا۔

مجھے اور میرے بھائی کو کوئٹہ کینٹ پولیس اسٹیشن لے جایا گیا جہاں ہم صبح گیارہ بجے تک رہے۔ ریڑھ کی ہڈی یعنی حرام مغز کے زخم کے باعث میرا پیشاب میرے اختیار میں نہیں رہتا۔ اچانک گرفتاری کی وجہ سے میں شدید تکلیف میں تھا۔ پولیس اہلکاروں سے پیمپر لانے کی درخواست کی مگر کوئی جواب نہ آیا اور مجبوراً کمرے میں پڑی ایک پلاسٹک تھیلی سے گزارا کرنا پڑا۔ وہاں سے میرے بھائی کو ہوده جیل بھیج دیا گیا اور مجھے بجلی روڈ تھانے منتقل کر دیا گیا جہاں کچھ قیدی پہلے سے موجود تھے۔ تین دن وہاں گزرنے کے بعد مجھے ایک بار پھر کینٹ لایا گیا اور اس بار ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ وہ تین دن شاید میری زندگی کے مشکل ترین لمحے تھے۔ تین دن تک بھوکا، پیاسا اور مکمل تنہائی میں رکھا گیا۔ بھوک اور پیاس کو انسان کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیتا ہے، لیکن وہ بے بسی جو روح کو توڑ دیتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ جب آپ اتنے مجبور ہوں کہ پیشاب اور پاخانہ اسی بستر میں کریں اور اسی میں سوئیں تو کوئی جانور بھی ایسی قید قبول نہ کرے۔ لیکن ایک بلوچ کو، ایک غلام کو، اس سے بھی بدتر حالات پر خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کال کوٹھڑی میں وقت جیسے منجمد ہو جاتا ہے۔ اندھیرا اتنا گہرا ہے کہ دن اور رات کی تمیز مٹ جاتی ہے صرف ایک ایسی رات باقی رہتی ہے جو ختم نہیں ہوتی۔ آپ کو لگتا ہے صدیاں بیت گئیں، مگر وہ بس ایک کالی رات ہوتی ہے لمبی، بے رحم اور خاموش۔

ہم نے پاکستانی ریاست کے مظالم بہت سنے تھے-کتابوں میں پڑھے، لوگوں کی زبانی سنے، سوشل میڈیا پر دیکھے لیکن جب میں خود ہوده جیل کے اندر گیا تو سننے اور دیکھنے میں جو فرق ہوتا ہے، وہ اس روز میری روح کی گہرائیوں تک اتر گیا۔ قیدیوں کی قطاروں میں ایک طرف ستر سال

سے زیادہ عمر کے بزرگ تھے جن کے جھریوں بھرے چہروں پر زندگی کی تھکاوٹ اور ریاستی بے رحمی دونوں ایک ساتھ نقش تھے، اور دوسری طرف اٹھارہ سال سے کم عمر کے وہ نوجوان لڑکے تھے جن کی آنکھوں میں خواب ابھی بجھے نہیں تھے لیکن ہاتھوں میں زنجیریں پڑ چکی تھیں۔ یہ کوئی مجرم نہیں تھے ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے لوگوں کی آواز اٹھائی تھی، اپنے حق کی بات کی تھی۔

بلوچ یکجہتی کمیٹی کے خلاف اس کریک ڈاؤن نے صرف ایک تنظیم کو کچلنے کی کوشش نہیں کی، اس نے پوری بلوچ سیاسی سوچ کو خاموش کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ ریاست کا پیغام بالکل صاف اور بے پردہ تھا کہ بولو گے تو رعایت نہیں بوڑھے ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد، استاد ہو یا طالب علم۔ جب ریاست ستر سالہ بزرگ کو بغیر کسی جرم کے قید کر سکتی ہے اور سترہ سالہ لڑکے کو سلاخوں کے پیچھے بھیجنے میں شرم محسوس نہیں کرتی تو یہ قانونی کارروائی نہیں رہتی یہ خوف کی سیاست بن جاتی ہے، یہ ایک پوری قوم کے وجود پر سوالیہ نشان لگانے کی کوشش بن جاتی ہے۔ اور یہی وہ لمحہ ہے جب بلوچ نوجوان کے ذہن میں ایک بہت بڑا سوال جنم لیتا ہے، کیا اس ریاست میں اس کا وجود واقعی ممکن ہے؟ کیا اس کی زبان، اس کی شناخت، اس کی سیاسی سوچ یہ سب مٹا دینا ریاست کا اصل ہدف ہے؟ یہ کریک ڈاؤن انہیں خاموش نہیں کر رہا بلکہ یہ انہیں اپنے وجود کے بارے میں ازسرنو سوچنے پر مجبور کر رہا ہے، اور یہ سوچ کسی بھی جیل کی دیوار سے زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتی ہے۔

ہاں، یہ سچ ہے کہ اس کریک ڈاؤن نے جزوی طور پر لوگوں کو خاموش کیا ہے۔ لوگ ڈرے ہیں، گھروں میں سمٹ گئے ہیں، آوازیں دھیمی ہو گئی ہیں۔ لیکن یہ خاموشی نظریے کی موت نہیں یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کوئی ریاست اپنے ہی شہریوں کو بغیر جرم، بغیر مقدمے اور بغیر انصاف کے قید کرتی ہے تو وہ دراصل اپنی اخلاقی شکست کا اعلان خود کرتی ہے۔ جب ستر سالہ بزرگ کو جیل بھیجا جاتا ہے تو اس کے گھر میں بیٹھا پوتا خاموش نہیں رہتا وہ سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ جب پندرہ سالہ لڑکے کو گرفتار کیا جاتا ہے تو اس کی ماں کے آنسو

کسی نہ کسی دن ایک مضبوط آواز ضرور بنتے ہیں۔ ریاست جسموں کو قید کر سکتی ہے لیکن سوال کو نہیں۔ یہ دیواریں شاید ابھی خاموش کھڑی ہیں، لیکن ان کے پیچھے جو کہانیاں دفن ہیں وہ ایک دن ضرور بولیں گی۔ ہودہ جیل میں جو منظر تھا وہ محض ایک جیل کا منظر نہیں تھا وہ اس ریاست کا اصل چہرہ تھا جو سیاسی کارکنوں کو خاموش کرنے کے لیے ہر حد پار کرنے کو تیار ہے۔ اور یہ چہرہ جتنا بھی چھپانے کی کوشش کی جائے گواہ موجود ہیں، آنکھیں موجود ہیں، ضمیر موجود ہے۔ ظلم چاہے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو تاریخ میں اس کا انجام ہمیشہ شکست رہا ہے۔ اور اس بات کے گواہ موجود ہیں، یہ سوال موجود ہے، وہ سوال جسے کوئی جیل، کوئی کال کوٹھڑی اور کوئی ریاست کبھی قید نہیں کر سکتی۔

کچھ لوگ اب بھی شاید اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جیل ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ،سبغت اللہ بلوچ، بیبو بلوچ اور گل زادی بلوچ کو کمزور کر دی گئی اور وہ اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائیں گے تو وہ احمقوں کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ آج سلاخوں کے پیچھے اپنے لوگوں سے دور اپنے فیملی، گھر اور دوستوں سے دور ہوے 1 سال پورا ہونے کو ہے، یہ سال تکلیفوں سے بھری پڑی ہے اور اگے اور بھی ہوں گے لیکن مزاحمت کا راستہ انسان کو دن بہ دن مضبوط بناتا ہے،پہلے مجھے لگتا تھا کہ ہم نے مزاحمت کا راستہ چنا ہے لیکن اس ایک سال کے قید نے مجھے سکھایا کہ مزاحمت نے ہمیں چنا ہے۔

بیبرگ بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

17مارچ 2026

عید کی خوشی میں اپنے گمشدہ لوگوں کی یاد

یہ عید بھی پہلے جیسی نہیں۔ شاید اب ہماری کوئی عید پہلے جیسی نہ رہے۔ بلوچستان میں عید کا چاند تو نکل آتا ہے، مگر کتنے گھروں کے آنگن میں روشنی نہیں اترتی۔ کتنے دروازے آج بھی کھلتے ہیں، مگر اُن سے اندر آنے والا کوئی اپنا نہیں ہوتا۔کتنی مائیں آج بھی دسترخوان سجاتی ہیں، مگر اُن کی نگاہیں پلیٹوں پر نہیں، راستوں پر ٹکی رہتی ہیں۔کتنی بہنیں آج بھی عید کی صبح دوپٹہ اوڑھتی ہیں، مگر اُن کے دل پر انتظار کی شکنیں پہلے سے زیادہ گہری ہوتی ہیں۔ کیونکہ جب ایک قوم کے گھروں سے لوگ چھین لیے جائیں، جب ماؤں کی دعائیں انتظار میں بدل جائیں، جب دروازوں پر دستک کی جگہ خاموشی کھڑی ہو، تو تہوار صرف خوشی نہیں رہتے، وہ یاد، درد اور وفا کا امتحان بن جاتے ہیں۔

اس عید جب آپ اپنے پیاروں کو گلے لگائیں، تو اُن بھائیوں کو ضرور یاد رکھیے جو آج بھی آپ سے دور، جبری گمشدگی کے اندھیروں میں کہیں گم ہیں، اور جن کے گھر والوں کے لیے عید کا چاند خوشی نہیں، ایک اور طویل انتظار لے کر آتا ہے۔

جب آپ نئے کپڑے پہنیں، تو اُن لوگوں کو یاد رکھیے جنہیں اس سرزمین نے بنا کفن اپنے سینے میں چھپا لیا۔ جب آپ میٹھی چیزیں کھائیں، تو اُن گھروں کو یاد رکھیے جہاں غربت، محرومی اور ریاستی ناانصافی نے چولہے کی آنچ تک مدھم کر دی ہے۔ اور جب آپ اپنی ماں اور بہن کے لیے عید کا دوپٹہ خریدیں، تو ایک لمحے کے لیے یہ بھی یاد رکھیے کہ اسی دھرتی پر یہی دوپٹے سڑکوں پر گھسیٹے گئے، یہی دوپٹے احتجاج میں لہراتے رہے، اور یہی دوپٹے آج بھی اُن عورتوں کے شانوں پر ہیں جن کے پیارے لاپتہ ہیں اور جن کی آنکھوں میں عید سے زیادہ انتظار بستا ہے۔

مگر میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ عید نہ منائیے۔ عید منائیے مگر اس طرح کہ آپ کی خوشی میں اپنی قوم کی یاد شامل ہو، آپ کی مسکراہٹ میں اپنے گمشدہ لوگوں کا نام شامل ہو، اور آپ کے ہر تہوار میں اُن گھروں کا حصہ ہو جہاں عید کے دن بھی ادھوراپن دسترخوان کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔

آپ ایک ایسی قوم ہیں جس نے دکھ دیکھا ہے، مگر دکھ نے آپ کی اخلاقی قامت کو چھوٹا نہیں کیا۔ آپ نے جدائی سہی ہے، مگر جدائی نے آپ کے دل سے محبت نہیں نکالی۔ آپ نے ظلم دیکھا ہے، مگر ظلم کے باوجود آپ نے اپنی شرافت، اپنی غیرت، اور اپنے اجتماعی وقار کو زندہ رکھا ہے۔

اسی لیے اس عید اپنے دلوں کو سخت نہیں، زندہ رکھیے۔ اپنی یاد کو کمزور نہیں، روشن رکھیے۔ اپنے گمشدہ لوگوں کو صرف تصویروں میں نہیں، اپنی دعاؤں، اپنی گفتگو، اپنی خاموشیوں اور اپنی عیدوں میں زندہ رکھیے۔ یہ عید صرف نئے کپڑوں، میٹھی سوغاتوں اور وقتی مسکراہٹوں کا نام نہیں؛ یہ عید اُن رشتوں کی بھی ہے جو چھین لیے گئے، اُن ناموں کی بھی ہے جو پکارے جا رہے ہیں، اور اُن آنکھوں کی بھی ہے جو دروازے پر اب بھی ٹھہری ہوئی ہیں۔

آپ کے تہوار ادھورے ضرور ہیں، مگر آپ کی روح ادھوری نہیں۔ آپ کے گھروں میں خاموشی ضرور ہے، مگر آپ کی یاد خاموش نہیں۔ اور آپ کے دلوں میں درد ضرور ہے، مگر اسی درد میں ایک ایسی روشنی بھی ہے جو ظلم کے اندھیروں سے بڑی ہے۔

عید مبارک اپنے گمشدہ لوگوں کو یاد رکھ کر، اپنے غم کو وقار دے کر، اور اپنے دل کو انسانیت سے بھر کر۔

بیبرگ بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

20مارچ2026

باب سوئم: صبغت اللّٰہ شاہ جی

تعارفِ صبغت اللّٰہ

سبغت اللّٰہ شاہ جی ایک سیاسی کارکن اور بلوچ یکجہتی کمیٹی (بی وائی سی) کے مرکزی رہنما ہیں۔ وہ 20 اکتوبر 1983 کو درپکان، زامران، بلوچستان میں ایک معزز بلوچ عالم مولانا عبد الحق بلوچ کے گھر پیدا ہوئے۔ 1990 کی دہائی میں ان کا خاندان اپنے آبائی علاقے زامران سے ہجرت کرکے کوئٹہ منتقل ہوا تھا، جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی اور اہم سال گزارے۔ شاہ جی نے اپنی ابتدائی تعلیم تعمیرِ نو اسکول سے حاصل کی اور بعد ازاں تعمیرِ نو کالج کوئٹہ سے کالج کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد انہوں نے جامعہ بلوچستان سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔

اپنی طالب علمی کے دور میں وہ طلبہ سیاست میں سرگرم رہے اور اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ تھے۔ طلبہ سیاست کے تجربے نے ان کی سیاسی شعور اور بلوچستان کے سماجی و سیاسی مسائل میں دلچسپی کو مزید گہرا کیا۔ ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ 2010 میں اس وقت آیا جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ اس واقعے کے بعد وہ بلوچستان کی قوم پرست سیاست میں زیادہ گہرائی سے شامل ہو گئے۔ انہوں نے ریلیوں کا انعقاد کیا اور مختلف احتجاجی مظاہروں میں حصہ لیا تاکہ بلوچستان میں ریاستی جبر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو اجاگر کیا جا سکے۔

دو ہزار بیس میں سبغت اللّٰہ شاہ جی نے حق دو تحریک میں شمولیت اختیار کی، جو بلوچستان میں سماجی، معاشی اور سیاسی حقوق کے لیے سرگرم ایک تحریک تھی۔ تاہم بعد میں انہوں نے اس

تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی جب حق دو تحریک نے پارلیمانی انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا، جسے وہ جعلی انتخابات سمجھتے تھے۔ حق دو تحریک سے علیحدگی کے بعد انہوں نے بلوچ یکجہتی کمیٹی میں شمولیت اختیار کی اور اسے بلوچ عوام کو منظم کرنے اور انہیں اپنے حقوق اور درپیش چیلنجز کے بارے میں سیاسی شعور دینے کا ایک پلیٹ فارم سمجھا۔ جلد ہی وہ اس تنظیم کے مرکزی رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔ انہوں نے مختلف سیاسی پروگرام اور احتجاجی سرگرمیوں کے انعقاد میں اہم کردار ادا کیا۔

شاہ جی ان رہنماؤں میں شامل تھے جو بالاچ بلوچ کے لیے انصاف کے مطالبے کی تحریک میں صفِ اول میں کھڑے رہے، جنہیں ریاستی حراست میں قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ تربت سے کوئٹہ اور پھر اسلام آباد تک ہونے والے تاریخی لانگ مارچ کے سرکردہ رہنماؤں میں شامل تھے۔

جولائی 2024 کو گوادر میں منعقد ہونے والے بلوچ راجی مُچی اور جنوری 2025 کو وہ دالبندین میں منعقد ہونے والے بلوچ راجی مچی کے صف اول کے قیادت میں شامل تھے۔ ہر مارچ، ہر اجتماع اور ہر سیاسی پروگرام میں شاہ جی ثابت قدمی سے صفِ اول میں کھڑے رہے اور بلوچ قوم کے خلاف جاری نسل کشی کے خلاف ایک بے خوف آواز بنے رہے۔

تیئس مارچ 2025 کو سبغت اللہ شاہ جی کو کوئٹہ میں ان کے گھر سے پاکستانی قانون نافذ کرنے والے اداروں نے گرفتار کر لیا۔ یہ گرفتاری بی وائی سی کے خلاف ریاستی کریک ڈاؤن کے دوران عمل میں آئی۔ تب سے وہ جھوٹے مقدمات اور جعلی ایف آئی آرز کے تحت جیل میں قید ہیں۔ بلوچستان بھر میں ان کی جدوجہد اور بڑھتی ہوئی عوامی حمایت نے انہیں ریاست کے لیے ایک براہِ راست ہدف بنا دیا تھا۔ ان کی گرفتاری بی وائی سی کی قیادت کے خلاف وسیع ریاستی کارروائی کا حصہ تھی، جس کا مقصد جدید دور کی سب سے منظم اور پرامن بلوچ سیاسی مزاحمتی تحریک کو کمزور کرنا تھا۔ اس وقت بھی وہ غیر قانونی حراست میں ہیں۔

سبغت اللہ شاہ جی کی جدوجہد صرف ایک فرد کی کہانی نہیں بلکہ ایک پوری قوم کی داستان ہے جو سر تسلیم خم کرنے سے انکار کرتی ہے۔ وہ اس قوم کے رہنما اور امید ہیں جس کی شناخت اور وجود کو آہستہ آہستہ مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پاکستانی ریاست ان سے اس لیے خوفزدہ ہے کیونکہ وہ نوآبادیاتی جبر، جبری گمشدگیوں اور ایک پوری قوم کے خلاف جاری نسل کشی کے خلاف بلوچ مزاحمت کی علامت بن چکے ہیں۔ قید و بند کے باوجود ان کا عزم متزلزل نہیں ہوا اور بلوچ قومی جدوجہد کے ساتھ ان کی وابستگی مکمل اور غیر متزلزل ہے۔

یہاں بشار الاسد کے والد کا دور چل رہا ہے

شہید احسان بلوچ کی والدہ کوئٹہ پریس کلب کے سامنے قانون کے مطابق دھرنا دے کر خاموشی سے بیٹھی رہیں اور صرف یہ سوال کرتی رہیں کہ:

"میرے بیٹے کا کیا قصور تھا؟ اسے بے گناہ کیوں مارا گیا؟"

ان کی خواہش صرف اتنی ہے کہ ذمہ داروں کو سزا دی جائے اور انہیں قانون کے مطابق انصاف ملے۔ مگر بلوچستان کی سرزمین پر یہ خاموش احتجاج بھی قبضہ گیر قوتوں کو گوارا نہیں۔ خاکی وردی والے فوجی کو سزا دینا تو دور کی بات ہے، الٹا شہید احسان کی والدہ پر تشدد کرکے انہیں وہاں سے اٹھا لیا گیا۔ یہ منظر ایک بار پھر اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ بلوچ ماں اپنی ہی سرزمین میں کس قدر لاوارث ہے۔

کراچی میں، جہاں گینگ وار کے نام پر بلوچوں کی ایک پوری نسل نے بوری بند لاشیں اٹھائیں اور جہاں بلوچوں کی بڑی آبادی موجود ہے، وہاں زاہد علی بلوچ کی فیملی کئی ہفتوں تک کراچی پریس کلب کے سامنے احتجاجی دھرنے میں بیٹھی رہی۔ ان کے والد عبدالحمید، جو ہیپاٹائٹس کے مریض ہیں، ڈیڑھ ماہ سے زائد عرصے تک اپنے جبری گمشدہ بیٹے کی باحفاظت رہائی کے لیے دھرنا دیتے رہے۔ یہ خاندان صرف یہ چاہتا ہے کہ زاہد بلوچ کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ اگر اس کا کوئی جرم ہے تو اسے اپنی ہی عدالتوں میں پیش کرکے جرم ثابت کیا جائے، مگر ان کی فریاد سنے گا کون؟ وہاں بھی دشمن یہی خاکی وردی، اس کی ISI اور MI ہے۔ ریاستی فوج کے سامنے جج اس قدر بے بس ہیں کہ کسی فوجی کو کسی بلوچ کے کیس میں عدالت بلانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

بلوچستان میں ریاستی فوج نے ظلم میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ڈرون حملے ان کا معمول بن گئے ہیں اور یہ ڈرون طیاروں کا تجربہ بھی بلوچ اور پشتون آبادیوں پر حملے کرکے کرتے ہیں۔ ISI اور MIنے ٹارگٹ کلنگ میں بھی بے تحاشا اضافہ کر دیا ہے۔

معروف محقق Christopher Phillips اپنی کتاب Battle Ground میں شام کے حوالے سے ایک لطیفہ لکھتے ہیں کہ بشار الاسد کا دور اپنے والد کے دور سے بہتر تھا، کیونکہ بشار کے دور میں اگر آپ صدر کے خلاف بات کرتے تو صرف "آپ" لاپتہ یا اغوا ہوتے، جبکہ بشار کے والد کے دور میں اگر آپ صدر کے خلاف بات کرتے تو "آپ" سمیت آپ کا پورا خاندان اور آپ کے دوست بھی لاپتہ یا اغوا ہو جاتے۔ بلوچستان کی صورتحال آج اسی مثال کی عکاسی کرتی ہے، یہاں بشار الاسد کے والد کا دور چل رہا ہے۔

صبغت اللہ شاہ جی

ہدہ جیل، کوئٹہ

23ستمبر 2025

فورتھ شیڈول، ففتھ شیڈول، سکسٹھ شیڈول

(4th Schedule, 5th Schedule, 6th Schedule)

پاکستان ءِ گھڑی ٹیمبا نہ اِنت، شیڈول ءِ جند خراب اِنت، سک خراب اِنت۔۔

(پاکستان کی گھڑی ٹھیک نہیں، شیڈول ہی خراب ہے، بہت خراب ہے)۔

بلوچستان میں پُرامن سیاسی پروگراموں پر پابندی ہے۔ حق کی بات کرنے کے لیے سیمینار اور پریس کانفرنس کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔ ڈاکٹر صبیحہ بلوچ، سمی دین بلوچ، ڈاکٹر شلی بلوچ، سید بی بی بلوچ، نازگُل بلوچ، شکیل بلوچ، عبدالغنی بلوچ، حبیب بلوچ، طارق بلوچ اور شفیق بلوچ سمیت تربت سے لے کر خضدار اور چاغی تک کئی علاقوں سے درجنوں بلوچ سیاسی کارکنوں، طلبہ اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے نام فورتھ شیڈول میں ڈالے گئے ہیں تاکہ انہیں سیاسی پروگراموں سے دور رکھا جائے۔

دشمن یہ نہیں جانتا کہ بلوچوں کے سامنے آپ کے یہ آرڈرز صرف کاغذ کے ٹکڑے ہیں، وہ ایسی چیزوں سے پریشان نہیں ہوتے۔ آپ کاغذ پر لکھیں یا نہ لکھیں، ہر بلوچ کا نام آپ کے فورتھ شیڈول میں شامل ہے اور گزشتہ بیس سالوں سے شیڈول کے مطابق بلوچوں کی لاشیں گرائی جا رہی ہیں۔ گزشتہ چند مہینوں سے ریاستی آرمی اور اس کے خفیہ اداروں کی جانب سے لاشیں گرانے کا سلسلہ مزید تیز کر دیا گیا ہے، اور دوسری طرف خوف میں مبتلا بلوچستان میں ریاست کی "کومنتانگ حکومت" بلٹ پروف گاڑیوں کا مطالبہ کر رہی ہے۔

جس طرح ریاست نے پارٹی، مسلک، قبیلہ، گروہ، رنگ و نسل اور ہر قسم کی تفریق سے بالاتر ہو کر صرف "گناہِ قومیت" کی بنیاد پر بلوچ قوم کے قتلِ عام کی پالیسی اختیار کی ہے، بلوچ قوم کو

بھی ہر قسم کی تفریق ختم کر کے متحد ہونا ہوگا۔ تمام نظریات، تحریکوں، پارٹیوں اور گروہوں کا ایک پلیٹ فارم پر ہونا ضروری ہے۔ اتحاد و یکجہتی کے علاوہ بلوچ قوم کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ جس طرح ریاست بلوچ قوم کو تقسیم کرنے کا ہر حربہ استعمال کر رہی ہے، اسی طرح بلوچ قوم کو بھی اتحاد، اتفاق اور یکجہتی کا ہر طریقہ استعمال کر کے دشمن کے عزائم ناکام بنانے ہوں گے۔

گزشتہ ستر سالوں سے یہ ریاستی ادارے نہ ہی بلوچستان کا مسئلہ سمجھ سکے اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کی۔ اب بلوچ قوم مزید کسی کو سمجھانے کے موڈ میں نہیں، کیونکہ بیوقوف انسان کو سمجھانے میں دن اور مہینے لگتے ہیں، اور بیوقوف گدھوں کو سمجھانے کے لیے پوری عمر لگ جاتی ہے، اور آخر میں مایوسی ہی ملتی ہے۔

صبغت اللہ شاہ جی

ہدہ جیل، کوئٹہ

23اکتوبر 2025

بلوچ خواتین کی جبری گمشدگی

عرصے سے لاپتہ زرینہ مری بلوچ کو شاید بہت سے لوگ بھول گئے ہیں، کیونکہ اُس زمانے میں سوشل میڈیا کا استعمال اتنا عام نہیں تھا۔ اسی لیے ریاستی ادارے بار بار اس واقعے پر بلوچ قوم کو دنیا کے سامنے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ زرینہ بلوچ نامی کوئی عورت سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ مگر ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ زرینہ بلوچ اور نازیہ بلوچ دونوں حقیقت میں موجود تھیں۔

ریاستی فوج اور اس کے خفیہ اداروں کے ہاتھوں ماہ جبین بلوچ گزشتہ چھ ماہ سے لاپتہ ہے۔ پنجگور میں نازیہ بلوچ کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ اب حب چوکی سے آواران کی رہائشی نسرینہ بلوچ کو بھی اغوا کر لیا گیا ہے۔

ماہ جبین بلوچ اور نسرینہ بلوچ سمیت نہ جانے کتنی ایسی خواتین ہیں جن کے بارے میں میڈیا میں کچھ بھی سامنے نہیں آیا۔ دشمن نے جو کرنا ہے کرے گا، لیکن بلوچ قوم کو اپنے لوگوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔ دشمن مارے گا، لاپتہ کرے گا اور دبانے کی کوشش بھی کرے گا؛ ایسے میں قوم کے پاس دو ہی راستے ہیں:

یا تو تماشائی بن کر اپنی بہنوں کو لاپتہ اور مرتا ہوا دیکھتے رہیں،

یا خود کو تاریخ میں ایک زندہ قوم کی حیثیت سے امر کر دیں۔

اگر دشمن ریاست کو اس حد تک جانے کی اجازت ہے، تو میرے دین کی تعلیمات اور دنیاوی اخلاقیات کی رو سے بلوچ قوم کے فرائض کیا بنتے ہیں؟ کیا ہم بیٹھ کر صرف اپنی قوم کی بیٹیوں کی عزتیں پامال ہوتے دیکھتے رہیں؟ اپنے نوجوانوں اور بچوں کی لاشیں اٹھاتے رہیں؟

خاموش بیٹھ کر تماشا دیکھنے والوں کو لوگ سو سال بعد بھی مردہ ضمیر کہیں گے۔

تاریخ صرف اُنہیں زندہ رکھے گی اور یاد کرے گی جو جانوں کی پرواہ نہیں کریں گے، جو نہیں ڈریں گے اور جو ظلم کے آگے آواز بلند کریں گے۔

صبغت اللہ شاہ جی

ہدہ جیل کوئٹہ

23نومبر 2025

ریسٹ اِن پاور، ماما

انتہائی گہرے دکھ اور افسوس کے ساتھ ہم ماما قدیر بلوچ کے انتقال پر سوگوار ہیں، جو مزاحمت، صبر اور غیر متزلزل جرات کی ایک بلند علامت تھے۔ چودہ سال سے زائد عرصے تک انہوں نے جبر و ظلم کی کٹھن راہوں پر صرف لاپتہ افراد کی تصاویر اور انصاف پر اٹوٹ یقین کے سہارے سفر جاری رکھا۔ ان کی زندگی محض گزاری نہیں گئی بلکہ بلوچ قوم کی عزت و وقار کے لیے قربان کر دی گئی۔

ماما قدیر طاقت یا مراعات کے ہتھیار سے لیس نہیں تھے؛ وہ سچائی کے ہتھیار سے مسلح تھے۔ انہوں نے ذاتی صدمے کو اجتماعی جدوجہد میں تبدیل کر دیا اور جبری گمشدگیوں، ریاستی تشدد اور منظم جبر کے خلاف بے خوف کھڑے رہے۔ بڑھاپے میں بھی، جب ان کا جسم کمزور ہو گیا تھا، ان کی آواز کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ وہ بے آوازوں کی آواز بنے، ہزاروں خاندانوں کے دکھ کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھا اور اپنی آخری سانس تک دھمکیوں کے سامنے جھکنے سے انکار کیا۔

ان کے جسمانی جدائی نے ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جسے کوئی فرد پُر نہیں کر سکتا۔ وہ صرف ایک انسان نہیں تھے؛ وہ ایک تحریک، ایک ضمیر اور ایک مظلوم قوم کے لیے اخلاقی رہنما تھے۔ پاکستانی ریاست کے مظالم کبھی بھی اس میراث کو شکست نہیں دے سکتے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، ایک ایسی میراث جو استقامت، مزاحمت اور سچائی میں رقم ہے۔

آج جب ہم سوگ منا رہے ہیں تو ہمیں اپنے عزم کی تجدید بھی کرنی چاہیے۔ ماما قدیر کو سب سے بڑا خراجِ عقیدت صرف آنسو نہیں بلکہ ان کے مشن کو جاری رکھنا ہے۔ ہم پوری بلوچ قوم، سیاسی کارکنوں، طلبہ، بزرگوں اور بیرونِ ملک مقیم بلوچ برادری سے اپیل کرتے ہیں کہ بلوچستان میں

جبری گمشدگیوں اور ہر قسم کے ریاستی جبر کے خلاف متحد رہیں۔ اتحاد کو اپنی طاقت اور انصاف کو اپنی منزل بنائیں۔

ماما قدیر اب ہمارے درمیان نہیں رہے، مگر ان کے قدموں کے نشانات مزاحمت کی ہر راہ پر باقی ہیں۔ وہ ہماری جدوجہد، ہماری یکجہتی اور انصاف کے لیے ہمارے غیر متزلزل مطالبے میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

صبغت اللہ شاہ جی

ہدہ جیل کوئٹہ

20دسمبر 2025

بلوچستان غیر بلوچ دانشوروں کے نقطۂ نظر سے

گزشتہ دو سے ڈھائی دہائیوں میں بلوچستان میں تیزی سے تبدیلیاں آئیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے گوادر کو فوجی چھاؤنی میں بدلتے دیکھا۔ ریکوڈک اور سیندک کا سونا، سوئی گیس، کوئلہ، کرومائٹ، سنگِ مرمر اور کئی دیگر معدنیات ، جنہیں مسئلے سے دلچسپی ہوتی وہ ان پر گفتگو کرتے۔ ہم جیسے لوگ صرف نام سنتے اور پنجاب میں گیس پائپ لائن دیکھ کر خوش ہوتے کہ بلوچستان کا کہیں نہ کہیں نام تو آرہا ہے۔

لیکن بعد میں پتہ چلا کہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بلوچستان کہاں ہے۔ ہمیں بلوچستان کا تعارف کروانے کے لیے گھنٹوں لگتے اور چوہدری گل فرمان کہتا: "اچھا تو آپ بلوچی ہیں؟" اور ہم دل میں کہتے: زلیخہ جنین ءِ مردین ءِ؟

پھر سمجھ آگیا کہ جن کو ہم اپنا تعارف کروا رہے ہیں وہ رٹا پارٹی ہیں۔ انہیں دلچسپی ہی نہیں، تو ہم کیوں ایسے لوگوں کو زبان سے سمجھانے کی کوشش کریں جو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے؟ ہم جو ہیں سو ہیں، اور اپنے تعارف کو دنیا میں ثابت کرنے کا واحد طریقہ سرزمین ہے۔

وہاں سے ہم دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ اگر ہم اپنی سرزمین میں طاقتور ہوں گے تو لوگ خود ہمیں ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے، ہمارے قصے سنیں گے اور دلچسپی بھی لیں گے۔ کیونکہ کہیں اور نہیں تو کم از کم ہم اپنی سرزمین کے مائی باپ ہیں۔

دہائیوں کی محنت اور قربانیوں کے بعد میرے خیال میں قوم اس پوزیشن پر آگئی ہے کہ دنیا میں اپنا تعارف کرا سکے، جو کہ پوری دنیا میں موجود ہمارے لوگ کر رہے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں کسی نہ کسی شکل میں اپنی موجودگی دکھا رہے ہیں، عالمی اداروں کے ذمہ داران سے مل رہے ہیں، عالمی مجالس میں ہماری قوم نظر آرہی ہے، اور اس کی وجہ سرزمین ہے جس پر دہائیوں

سے لاشیں گر رہی ہیں۔ بلوچ قوم کو اپنی CV مضبوط کرنے میں سات دہائیوں سے زیادہ کا وقت لگا۔

دنیا میں لوگ امیر سرزمین کے وارث ہونے پر خوش ہوتے ہیں، مگر دل میں سوچتے ہیں کہ جیسے تمام پاکستانی میڈیا والے اور غیر بلوچستانی ہمیں غریب صوبے والے کہتے ہیں۔ کاش ہم واقعی اتنے غریب ہوتے کہ پنجاب سے مزدور بلوچستان میں مزدوری کرنے نہ آتے، اور ان مزدوروں کی حفاظت کے لیے ان کے دیگر وردی والے مزدور نہ آتے۔ ہر کلومیٹر پر چیک پوسٹ نہ ہوتی، ہمارے شہر کے شہر فوجی چھاؤنی نہ بنتے، وردی اور بغیر وردی کے مزدور، جن کی شکلیں ہر موڑ پر نظر آتی ہیں شاید نہ دکھتے۔

ہماری ہر نسل سخت سے سخت حالات دیکھ رہی ہے بلکہ برداشت کر رہی ہے۔ موجودہ نسل شاید جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ پہلے والوں سے زیادہ ہے۔ اس نسل نے نواب بگٹی، نواب خیر بخش مری اور سردار عطا اللہ مینگل کو دیکھا، جن کے بارے میں ریاست کہتی ہے کہ بلوچ قوم کے مسئلے کی جڑ یہی ہیں۔ مگر اس نسل نے ان تینوں کو اس دنیا سے جاتے بھی دیکھا اور ان کے جانے کے بعد کے حالات بھی دیکھے۔

یہاں اس وقت ہر فرد ایک ٹیسٹ کیس ہے۔ جو بار بار لاشیں گرا کر پوچھتے ہیں کہ "بلوچستان دا مسئلہ کی اے؟" انہیں بتانا ہے کہ اسے سمجھنا بہت آسان ہے۔ قصہ بیان کرنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ کوئی لاہوری کہے گا: زلیخہ جنین ءِ مردین ءِ؟

بلوچستان میں دو الگ محاذ ہیں۔ ایک جنگی محاذ ہے جو خالصتاً ایک نظریے اور اپنی سرزمین کے لیے لڑی جا رہی ہے، جسے بیان کرنے کے لیے کتابیں لکھنی ہوں گی۔ یہ الگ بات ہے کہ ریاست کیا کہہ رہی ہے، مگر جب تک آپ حقیقت کو تسلیم کرکے مسئلے پر سنجیدہ نہیں ہوں گے، آپ مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔

دوسرا محاذ سیاسی ہے، جو جنگی محاذ سے بالکل الگ آئینی اور جمہوری جدوجہد ہے، جو قانون کے دائرہ کار میں رہ کر کی جا رہی ہے اور بار بار آئین و جمہوریت کی بات کر رہی ہے۔ بدقسمتی سے ریاست نے پوری قوم کو دشمن قرار دے دیا ہے، اور سیاسی جدوجہد کرنے والے بھی شہید اور لاپتہ ہو رہے ہیں۔

اسی سیاسی جدوجہد میں قوم کی ایک بڑی تعداد کا نظریے سے تعارف ریاستی جبر نے کرایا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے جبر دیکھا، حالات نے انہیں سبق دیا اور بہت کچھ سکھایا۔

آج سے 26 سال قبل شاید میں بھی ان حالات سے اتنا واقف نہیں تھا، مگر سنہ 2000 کے بعد ان حالات کو دیکھنے کے بعد خود ایک ٹیسٹ کیس بن گیا۔ ہوا یوں کہ مشرف کے آنے کے بعد قوم کو براہ راست دھمکیاں ملیں کہ ہم وہاں سے ہٹ کریں گے کہ پتہ بھی نہیں چلے گا۔

ہٹ کرنے والوں کو شاید یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ ایسی قوم ہے کہ مرنے کے بعد بھی گلے پڑ جاتی ہے، اور دو سو سال بعد بھی بدلہ معاف نہیں کرتی۔

2006میں نواب بگٹی صاحب کی شہادت کے بعد جلسوں اور ریلیوں پر پاکستانی فوج نے براہ راست فائرنگ کا سلسلہ شروع کیا۔ کچھ عرصے میں مکران میں تین الگ واقعات میں الطاف بلوچ، جاوید اختر اور مختار شہید ہوئے۔

الطاف بلوچ جب شہید ہوئے تو ہم چار پانچ ساتھیوں نے ان کی لاش اٹھائی۔ شہید کا خون میرے کپڑوں پر لگ گیا تھا، اور جب میں گھر پہنچا تو سب نے یہی سمجھا کہ شاید مجھے بھی گولی لگی ہے۔

یہ واقعہ بہت عجیب تھا، جب ریاست کی فوج نے براہ راست نہتے لوگوں پر گولیاں چلائیں۔ پھر استاد غلام محمد بلوچ، لالہ منیر بلوچ اور شیر محمد بلوچ کو شہید کر دیا گیا۔ اس نے بھی مجھ سمیت کئی لوگوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد میرے ایک بہت ہی پیارے دوست مراد جان گچکی کو اس کے بھائی اور ساتھیوں کے ساتھ ریاستی فوج نے ان کے گھر پر حملہ کرکے شہید کیا۔ یہ ایسا ریاستی جبر تھا جو درجنوں لوگوں نے دیکھا کہ پاکستانی فوج ایک گھر پر بمباری کر رہی ہے۔

اس دوران بلوچستان میں کشت و خون کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ درمیان میں کمی آئی، مگر اب ریاستی جبر انتہا پر ہے۔

ایسے میں ایک سیاسی کارکن کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرے۔ انہی حالات نے مجھ سمیت کئی افراد کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔

سرزمین اور اپنی قوم سے محبت ہر ایک کو ہونی چاہیے۔ یہ محبت قوم کے دیگر لوگوں کی طرح مجھ میں بھی ہے۔ مگر اس کو میرے والدیوں بیان کرتے تھے کہ: یہ زمین تمہاری ہے اور اس میں بسنے والے سب لوگ تمہارے ہیں۔اس کا عملی مظاہرہ یہ تھا کہ وہ گھنٹوں کا سفر دنوں میں کرتے۔ میں زیادہ تر شال، کراچی یا تربت کے سفر کے دوران ان کے ساتھ ہوتا۔ وہ کبھی مستونگ میں کسی دوست کے پاس ٹھہرتے، کبھی سوراب، کبھی خضدار اور کبھی حب میں۔ گوادر یا پنجگور و تربت گھر تھے، مگر انہوں نے اپنے عمل سے پورے بلوچستان کو گھر بنایا۔

مجھے بھی ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہر جگہ اپنائیت نظر آئی، اور شاید آج بھی بلوچستان میں جہاں جاتا ہوں تو ہر گھر اپنا نظر آتا ہے، ہر ایک کا درد اپنا محسوس ہوتا ہے۔

ایک سال سوراب کے ایک علاقے گیژدغان تعزیت کے لیے گئے، جہاں میرے ایک ماموں کے دوست کا انتقال ہوا تھا جو قطر میں ان کے ساتھ تھے۔ سفر دیر سے شروع کرنے کی وجہ سے ہم رات کو دیر سے گیژدغان پہنچے۔ وہاں ایک شخص نظر آیا جس سے ہم نے دریافت کیا کہ فلاں بندے کے گھر جانا ہے۔

اس نے فوراً کہا: "جی آپ پہنچ گئے ہیں، یہ اسی کا گھر ہے۔ وہ سوئے ہوئے ہیں، صبح آپ سے ملیں گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے اپنے گھر کا گیٹ کھولا اور ہمیں کہا کہ گاڑی اندر لے آئیں۔ ہم بھی حیران تھے کہ ہماری قسمت دیکھو، رات کے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آنے کے باوجود ہم سیدھے اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

رات گئے اس نے ہمیں کھانا کھلایا اور کہا کہ ابھی آرام کریں، صبح تسلی سے مجلس کریں گے۔ صبح ناشتہ دیا، اس کے بعد ہمیں ہمارے اصل میزبان کے پاس پہنچا کر کہا:

"اگر میں رات کو آپ لوگوں کو بتاتا کہ آپ کے بندے کا گھر آگے ہے تو ہمیں رات بارہ بجے کئی اور لوگوں کو نیند سے جگانا پڑتا۔ اور آپ شاید میرے پاس رہنے سے ڈر جاتے، کیونکہ شہر سے آئے ہو۔ مگر ہمارے ہاں بلوچی ماحول ہے، لہٰذا یہاں جب بھی آئیں تو سمجھیں کہ اپنے گھر میں ہیں۔"

دل میں خیال آیا کہ واقعی اس سرزمین کا ہر گھر ہمارا ہے، سب لوگ ہمارے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ کوئی یہ ماننے کو تیار ہو کہ یہ سرزمین میری ہے اور یہاں کا ہر فرد میرا خون ہے۔

میرے والد مجھے اکثر کہتے تھے کہ صرف زبانیں بولنے سے ہم بلوچ نہیں بن سکتے۔ بلوچ ایک ایسے زندہ کردار کا نام ہے جس میں قوم دوستی ہو، غیرت ہو، حمیّت ہو، بہادری ہو، مہمان نوازی ہو، روایات کا پابند ہو، سچا ہو، اور بہترین اخلاق اس کے اندر ہوں۔ اگر یہ سب اس میں نہ ہوں تو چاہے وہ کسی بھی بولی بولنے والا ہو، جس قبیلے، نسل یا علاقے سے بھی تعلق رکھتا ہو، وہ نامکمل ہے۔

2019-20کے بعد ہم نے مختلف سیاسی پروگرام شروع کیے۔ ان میں بڑا مسئلہ بارڈر کا تھا، جو ہمارے لوگوں کی روزی روٹی کا ذریعہ تھا، مگر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ اس مسئلے پر کئی دھرنے دیے۔ مختلف اوقات میں ہمارے دھرنے اور احتجاج جاری تھے کہ اسی دوران ہوشاب سے ہماری ایک بہن نور جان بلوچ کو ریاستی فوج اور خفیہ اداروں نے اغوا کر لیا۔ ہم نے ہوشاب میں دھرنا دیا۔یہ دھرنا جاری تھا کہ ایک اور بہن حبیبہ پیرجان کو کواچی سے اغوا کیا گیا۔ اس کے بعد کے

سیاسی پروگرام جاری رہے۔ پھر شہید بالاچ کا واقعہ ہوا۔ اس واقعے سے کچھ دن پہلے ریاستی اداروں نے تین نوجوانوں کو اغوا کیا، پھر انہیں مارنے کے بعد گاڑی میں ڈال کر دھماکے سے اڑا دیا تاکہ فوج کا نام نہ آئے۔

شہید بالاچ کے دھرنے کے بعد لانگ مارچ شروع ہوا جو اسلام آباد تک گیا۔ بلوچستان میں جگہ جگہ استقبال ہوا، اور تونسہ شریف کے لوگوں کا اپنی قوم کا حوصلہ بڑھانا الگ تاریخ ہے۔ اسلام آباد دھرنے میں ڈی جی خان اور ڈی آئی خان کے کئی ساتھیوں سے تفصیلی مجالس زندگی بھر یاد رہیں گی۔

(لانگ مارچ ایسا موضوع ہے جس پر الگ سے بہت زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔)

جو افلاطون کہتے تھے کہ بلوچ آئیں، اپنا مسئلہ بیان کریں، ریاست ماں ہے ماں ضرور سنے گی۔ ہمیں تو اس ماں کے بارے میں معلوم ہے کہ ہم دونوں (جن و اسپنتان) ہیں، جو رشتہ داری بالکل بھی نہیں کر سکتے۔ ہم اگر ماں کے پاس اپنا مسئلہ لے کر جائینگے تو ماں ہماری خاطر داری ڈنڈوں سے ہی کرے گی۔

مگر ان دانشوروں کا منہ بند کرنا تھا جو کہتے تھے کہ بلوچ نہیں آتے۔ ہم نہتے سیاسی لوگوں کے ساتھ اس ماں کا رویہ دنیا نے دیکھا۔ ایسے میں بھلا جنگی میدان کا بندہ کیسے ان سے بات چیت کر سکتا ہے؟

عام سیاسی ورکرز اور لواحقین، جن میں آدھے لوگ بوڑھے مرد و خواتین تھے، انہیں اسلام آباد میں بہت بے عزت کیا گیا۔ سڑکوں پر گھسیٹا گیا، مار مار کر تھانوں میں بند کیا گیا۔ اسلام آباد سے واپس مایوس آئے۔

مگر جو لوگ کہتے تھے کہ بلوچ آئیں، بات کریں، ماں سنے گی ، اگر ان میں غیرت ہے تو کم از کم دوبارہ ایسی بات نہیں کریں گے۔ اسلام آباد واپسی پر شال میں جو استقبال ہوا، اس نے ریاست پاکستان کو جواب دے دیا کہ آپ کا سلوک ہم زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔

آپ نے اسلام آباد میں جو کیا، اس سے بلوچستان میں رہنے والوں کو شدید تکلیف ہوئی۔

اس کے بعد گوادر راجی مچی اور دالبندین جلسہ بھی دو ایسے موضوعات ہیں کہ اگر ان کی تفصیل میں جاؤں تو یہ مضمون کتاب بن جائے گا۔ اس دوران کئی دھرنے، ریلیاں اور احتجاج ہوئے، جن میں گولیاں چلیں اور لوگ شہید ہوئے۔

پھر ریاست نے اعلان کر دیا کہ اب بلوچ قوم سے کھلی جنگ ہوگی۔ ان کا بوڑھا، جوان، بچہ ، چاہے مرد ہو یا عورت سب کا قتل عام ہوگا۔ اس قوم کا ہر فرد مجرم ہے۔ اور ریاست نے گیم شروع کر دی۔

سیاسی ورکرز آسان ہدف تھے، لہٰذا ان کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ کامریڈ بیبرگ بلوچ گرفتار ہوئے۔ اس پر سریاب روڈ پر احتجاج ہوا۔ ریاستی اداروں نے فائرنگ کی، کارکنان شہید ہوئے۔ کارکنان کی لاشوں کے ساتھ دھرنا ہوا، اس پر بھی حملہ ہوا۔

BYCکی آرگنائزر ڈاکٹر مہرنگ بلوچ اور بیبو بلوچ گرفتار ہوئیں۔ پھر مجھے گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد گل زادی بلوچ گرفتار ہوئیں۔

ہم ہدہ جیل میں ہر ہفتے پنجابی جج کے سامنے پیش ہوتے ہیں، اور پنجاب سے چوہدری آکر ہمارے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ سیاسی جدوجہد کے جرم میں نظر بلوچ اور غنی بلوچ کئی مہینوں سے جبری گمشدہ ہیں، جن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا رہا۔

ماہجبین بلوچ، نسرینہ بلوچ، فرزانہ بلوچ، رحیمہ بلوچ، ہیرالنساء بلوچ، فاطمہ بلوچ، عائشہ بلوچ سمیت کئی خواتین اور بچیاں ، جن کے نام ان کی فیملی ریاستی اداروں کی دھمکیوں کی وجہ سے میڈیا میں نہیں لاتیں ، جو شاید سیاسی جلسوں میں بھی نظر نہیں آئیں، ریاستی ٹارچر سیلوں میں قید ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ ان ٹارچر سیلوں میں وہ کس حال میں ہیں، زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

دہائیاں گزر گئے ہیں مگر بلوچستان میں ریاستی جبر جاری ہے۔ اب تو اس حد تک تیزی آ گئی ہے کہ قوم کے مرد و خواتین، چاہے بوڑھے ہوں یا بچے، اٹھا کر لاپتہ کیے جا رہے ہیں۔ لاشیں گرائی جا رہی ہیں۔ پورے کی پوری قوم کو دشمن قرار دیا گیا ہے۔

2026سے اس میں مزید تیزی آئی ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر لاشیں گرنے کی اطلاعات آتی ہیں۔ اتنا کچھ دیکھنے کے بعد قوم کا جذباتی ہونا فطری ہے، اور حالات و جذبات انسان کی ملاقات نظریے سے کراتے ہیں۔

ریاستی فوجی ذمہ داران امریکہ کے ایک دو چکر لگا کر اور امریکی صدر کے ساتھ اپنی تصویر بنوا کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ان گیم چینجرز میں شامل ہو چکے ہیں جو دنیا چلاتے ہیں۔

ایسے شیخ چلی جو الومیناتی بن کر پنڈی کے راجہ بازار میں بیٹھ کر نیو ورلڈ آرڈر ڈسکس کرتے ہیں، کبھی کبھار اچانک منہ کے بل گرتے ہیں اور اپنی بیوقوفیوں کی وجہ سے ان کی ناک ٹوٹ جاتی ہے۔

صبغت اللہ شاہ جی

ہدہ جیل کوئٹہ

7 مارچ 2026

باب چہارم: بیبو بلوچ

تعارف بیبو بلوچ

بیبو بلوچ 18 نومبر 1997 کوکوئٹہ میں پیدا ہوئیں اور کوئٹہ میں پرورش پائی۔ انہوں نے اپنی او لیول کی تعلیم ویلیڈرنس اسکول، کوئٹہ سے حاصل کی اور اے لیول دی سٹی اسکول، کوئٹہ سے مکمل کیے۔ بعد ازاں وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کراچی منتقل ہوئیں، تاہم ذاتی حالات کے باعث انہیں یہ پروگرام درمیان میں ہی چھوڑنا پڑا۔ بعد میں انہوں نے جامعہ بلوچستان سے اکنامکس میں ایم ایس سی مکمل کی۔

بیبو بلوچ ایک ایسے گھرانے میں پلی بڑھیں جہاں مالی مشکلات کے باوجود عزتِ نفس اور تعلیم کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی تھی۔ ان کی شخصیت پر ان کے والد کا گہرا اثر رہا، ان کے والد کامریڈ غفار بلوچ ایک دیرینہ سیاسی کارکن ہے جو کئی دہائیوں سے بلوچستان کے سیاست میں سرگرم ہے اور مسلسل جبری لاپتہ افراد کے خاندانوں کے شانہ بشانہ کھڑے رہتے ہیں ۔ کم عمری ہی سے بیبو اپنے والد کے ساتھ لاپتہ افراد کے لیے ہونے والے احتجاجی مظاہروں اور کیمپوں میں جاتی رہیں، جہاں انہوں نے متاثرہ خاندانوں کے درد، بے یقینی اور اذیت کو قریب سے دیکھا۔

یہ مسئلہ اس وقت ان کی ذاتی زندگی کا حصہ بھی بن گیا جب ان کے بہنوئی کو جبری طور پر لاپتہ کر دیا گیا۔ اس واقعے نے ان کے خاندان کو گہرے صدمے سے دوچار کیا اور بیبو کے اندر انصاف اور آواز اٹھانے کے عزم کو مزید مضبوط کر دیا۔ جو جدوجہد ابتدا میں ایک ذاتی دکھ اور تلاش سے شروع ہوئی تھی، وہ آہستہ آہستہ اس شعور میں بدل گئی کہ بلوچستان بھر میں بے شمار خاندان اسی درد اور مصیبت کا سامنا کر رہے ہیں۔

اجتماعی دکھ اور ذمہ داری کے احساس نے بیبو بلوچ کو لاپتہ افراد کے لیے جاری جدوجہد میں فعال کردار ادا کرنے کی طرف مائل کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ بلوچ یکجہتی کمیٹی بی وائی سی کے زیر اہتمام ہونے والے احتجاجی مظاہروں اور ریلیوں میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگیں اور رضاکارانہ خدمات انجام دینے لگیں۔ بالآخر وہ باقاعدہ طور پر اس تحریک کا حصہ بن گئیں اور آج بیبو بلوچ بلوچ یکجہتی کمیٹی کے ایک سرگرم رکن ہے۔ بیبو بلوچ کو 22 مارچ 2025 کو بلوچ یکجہتی کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کے ساتھ کوئٹہ میں ایک پرامن احتجاج کے دوران گرفتار کیا گیا اور وہ ایک سال سے قید ہے۔ بیبو بلوچ کو جیل میں بدترین کا تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا ۔

خاموش نسل کشی

بلوچستان کی تاریخ طویل عرصے تک عالمی اور علاقائی توجہ کے حاشیے پر رکھی گئی ہے۔ بلوچستان کی آواز اکثر جغرافیائی سیاست کے شور، اسٹریٹجک مفادات کی کشمکش اور طاقت کے بڑے بیانیوں کے درمیان دب کر رہ گئی ہے۔ تاہم اس مسئلے کو محض سیاسی تنازعات یا سرحدی دعوؤں کے تناظر میں سمجھنا ایک گہری انسانی حقیقت کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔ درحقیقت یہ معاملہ انسانوں، ان کی اجتماعی جدوجہد، ان کے دکھوں اور ان کے اس بنیادی حق سے متعلق ہے کہ وہ وقار اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ جہاں بیرونی دنیا اکثر بلوچستان کو محض ایک اسٹریٹجک خطے یا وسائل سے مالا مال جغرافیائی اکائی کے طور پر دیکھتی ہے، وہاں بلوچ قوم اپنی ایک الگ تاریخی اور اخلاقی روایت رکھتی ہے، ایسی روایت جس میں مزاحمت، ثابت قدمی اور انسانیت کے بنیادی اصولوں کے لیے غیر متزلزل اصرار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بیانیہ صرف جدوجہد اور بقا تک محدود نہیں بلکہ مٹائے جانے کے ایک طویل اور تدریجی عمل کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ یہ عمل کسی ایک لمحے میں وقوع پذیر ہونے والی تباہی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ نسلوں پر محیط ایک خاموش اور منظم عمل کے طور پر سامنے آتا ہے۔ بلوچ معاشرے میں ایک لفظ بار بار سنائی دیتا ہے جو اس اجتماعی تجربے کی شدت کو بیان کرتا ہے: نسل کشی۔ تاہم یہ وہ نسل کشی نہیں جو اچانک عالمی میڈیا کی سرخیوں میں جگہ بنا لے یا ایک ہی لمحے میں عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ دے۔ یہ ایک سست رفتار اور تھکا دینے والا عمل ہے جس کی شدت صرف ان جانوں سے نہیں ناپی جا سکتی جو ضائع ہو جاتی ہیں، بلکہ ان بے شمار زندگیوں سے بھی ماپی جاتی ہے جنہیں منظم طور پر ادھورا، غیر محفوظ اور غیر یقینی بنا دیا جاتا ہے۔

اس عمل کی بنیاد حقیقت کی ازسرِ نو تشکیل سے رکھی جاتی ہے۔ ایک ایسی فکری فضا پیدا کی جاتی ہے جس میں بلوچوں کو مکمل حقوق رکھنے والے شہریوں کے طور پر تسلیم کرنے کے بجائے ایک مسئلے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جسے قابو میں رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس بیانیے میں بلوچ شناخت کو ایک زندہ اور باوقار ثقافتی روایت کے طور پر تسلیم کرنے کے بجائے اسے ایک ممکنہ خطرے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جسے محدود یا کمزور کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک نوجوان جس کے پاس تنقیدی خیالات ہوں اسے شدت پسندی سے جوڑ دیا جاتا ہے، ایک شاعر کی اپنے وطن سے محبت کو علیحدگی پسندی کا نام دیا جاتا ہے، اور ایک ماں کے غم کو پروپیگنڈا قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے۔ حقیقت کی یہ مسخ شدگی دراصل تشدد کی پہلی اور سب سے گہری صورت ہے کیونکہ یہ ایک پوری قوم کی بنیادی انسانیت کو تسلیم کرنے سے انکار پر مبنی ہوتی ہے۔

اس فکری عمل کے ساتھ ساتھ ایک اور حقیقت بھی موجود رہتی ہے جسے منظم نظراندازی کہا جا سکتا ہے۔ بلوچستان کی سرزمین سے حاصل ہونے والے قدرتی وسائل اکثر دیگر علاقوں کی ترقی کے لیے استعمال ہوتے ہیں جبکہ مقامی آبادی بنیادی سماجی اور تعلیمی مواقع سے محروم رہتی ہے۔ بلوچ طلبہ کے اچانک لاپتہ ہو جانے کے واقعات اس اجتماعی اضطراب کو مزید گہرا کرتے ہیں، اور بعض اوقات یہ کہانیاں اس وقت دردناک انجام تک پہنچتی ہیں جب بعد میں مسخ شدہ لاشیں سنسان مقامات سے برآمد ہوتی ہیں۔ اس ماحول میں تعلیمی اداروں کی روزمرہ زندگی بھی خوف کے سائے سے خالی نہیں رہتی، کیونکہ اسکول یا یونیورسٹی سے رخصت ہونے والا ہر طالب علم اس یقین کے ساتھ واپس نہیں لوٹتا کہ اس کی زندگی محفوظ رہے گی۔

اسی پس منظر میں جبری گمشدگیوں کا ایک ایسا سلسلہ وجود میں آیا ہے جو وقت کے ساتھ ایک ہولناک معمول کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس عمل کا طریقہ کار اکثر ایک جیسا ہوتا ہے: بے نشان گاڑیاں، نامعلوم اہلکار اور ریاستی اداروں کی جانب سے ہر قسم کی شمولیت سے انکار۔ متاثرہ خاندانوں کو قانونی پیچیدگیوں اور ادارہ جاتی خاموشی کے ایسے دائرے میں دھکیل دیا جاتا

ہے جہاں جواب کی تلاش ایک طویل اور اکثر بے نتیجہ جدوجہد بن جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ تلاش اس وقت ختم ہوتی ہے جب کسی سنسان مقام سے ایک مسخ شدہ لاش ملتی ہے، جو اس خوفناک پالیسی کی علامت بن جاتی ہے جسے عام زبان میں "مارو اور پھینک دو" کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس عمل میں صرف ایک فرد کی جان نہیں لی جاتی بلکہ ایک واضح پیغام بھی دیا جاتا ہے کہ انسانی جان کی قدر کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔

اس صورتحال کی سب سے زیادہ تشویشناک خصوصیت یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ واقعات ایک طرح کی سماجی مانوسیت کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ دو دہائیوں پر محیط اس تسلسل نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے جس میں وہ واقعات جو کبھی شدید عوامی ردعمل پیدا کرتے تھے اب معمول کے واقعات کے طور پر دیکھے جانے لگے ہیں۔ ایک پوری نسل ایسے ماحول میں پروان چڑھی ہے جہاں دروازے پر دستک کا مطلب محض ایک عام ملاقات نہیں بلکہ کسی عزیز کے ہمیشہ کے لیے لاپتہ ہو جانے کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ عدالتی ادارے اکثر مداخلت کرنے سے قاصر یا غیر مؤثر دکھائی دیتے ہیں، میڈیا کی توجہ وقت کے ساتھ مدھم پڑ جاتی ہے، اور وسیع تر معاشرہ اکثر اس پیچیدہ صورتحال سے خود کو دور رکھنا زیادہ آسان سمجھتا ہے۔ اس طرح جرم کو براہِ راست چیلنج کرنے کے بجائے اسے روزمرہ زندگی کے ایک معمول کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے۔

تاہم کسی ظلم کا معمول بن جانا اس کے خاتمے کی علامت نہیں بلکہ اس کے مزید پھیلاؤ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ جب ایک نظام بلاخوف و احتساب جاری رہتا ہے تو اس کی شدت میں اضافہ ایک فطری امکان بن جاتا ہے۔ اسی تناظر میں حالیہ برسوں میں ایک تشویشناک رجحان یہ سامنے آیا ہے کہ جبری گمشدگیوں کا دائرہ اب بلوچ خواتین تک بھی پھیلایا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی بیک وقت حکمتِ عملی اور سماجی تباہی دونوں کی علامت ہے۔ اگر ماضی میں مردوں کو ممکنہ سیاسی خطرے کے طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا تو اب خواتین کو اس لیے نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ خاندان، سماجی یادداشت اور آنے والی نسلوں کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔ اس تبدیلی سے یہ

تاثر ابھرتا ہے کہ تشدد کی وہ تمام حدیں عبور کی جا چکی ہیں جو کبھی ناقابلِ عبور سمجھی جاتی تھیں۔

اس طرح کے حالات میں زندگی اچانک کسی ایک بڑے سانحے کے ذریعے نہیں بدلتی بلکہ ایک مسلسل دباؤ کے تحت آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ دباؤ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے لمحوں میں ظاہر ہوتا ہے، گھر کی میز پر وہ خالی کرسی جو کبھی دوبارہ نہیں بھر پاتی، ایک نوجوان عورت کی زندگی جو اپنے ذاتی خوابوں سے ہٹ کر لاپتہ بھائی کی تلاش میں گزرنے لگتی ہے، یا وہ خاموش خوف جو ہر روز کے معمولات میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں نسل کشی کا تصور صرف جسمانی تباہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ امکانات کے بتدریج خاتمے میں بھی ظاہر ہوتا ہے: محفوظ مستقبل کے خواب کا ٹوٹ جانا، سادہ خوشیوں کا زہر آلود ہو جانا اور ایک زندہ ثقافت کا دائمی سوگ اور اضطراب کی کیفیت میں محدود ہو جانا شامل ہیں۔

تاہم اس تاریک منظرنامے کے درمیان مزاحمت کی ایک قابلِ ذکر شکل بھی ابھر کر سامنے آئی ہے جس کی قیادت بلوچ خواتین کر رہی ہیں۔ ان کی جدوجہد روایتی طرز سیاست کے بجائے اخلاقی جرات اور اجتماعی یادداشت کی بنیاد پر استوار ہے۔ وہ ہتھیاروں کے بجائے اپنے لاپتہ عزیزوں کی تصاویر اٹھائے سڑکوں پر نکلتی ہیں اور اپنے مطالبات کو سیاسی نعروں کے بجائے خاندانی رشتوں اور محبت کی زبان میں بیان کرتی ہیں۔ ان کے سوال سادہ لیکن انتہائی طاقتور ہوتے ہیں: میرا باپ کہاں ہے؟ میری بہن کہاں ہے؟ اس طرح ان کی جدوجہد دراصل انسانیت کی بحالی کا ایک عمل بن جاتی ہے جس میں بے نام افراد کو دوبارہ نام دیا جاتا ہے، بے چہروں کو چہرہ ملتا ہے اور ذاتی کہانیاں ایک ایسے بیانیے میں واپس آتی ہیں جس نے انہیں مٹانے کی کوشش کی تھی۔

اس بحران کے حوالے سے عالمی ردعمل اکثر خاموش تشویش یا غیر مؤثر بیانات تک محدود رہا ہے، جس کے نتیجے میں عملی اقدام کی کمی خود ایک طرح کی شراکت داری کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ بلوچستان کی صورتحال کا سنجیدگی سے سامنا کرنا دراصل ایک اخلاقی سوال کا سامنا کرنا ہے:

مسلسل ظلم کا تسلسل کب ہمیں چونکانا چھوڑ دیتا ہے، اور ہماری خاموشی دراصل کس چیز کو ممکن بنا رہی ہوتی ہے۔

بلوچ عوام اپنی تکالیف اور مستقل مزاحمت کے ذریعے اسی خاموشی کو چیلنج کرتے ہیں۔ ان کی جدوجہد اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ نسل کشی کے خلاف سب سے بنیادی ردعمل صرف زندہ رہنا نہیں بلکہ مکمل انسان ہونے کے حق پر ڈٹ جانا ہے۔ یاد رکھنا، نام لینا اور جوابدہی کا مطالبہ کرنا ان کی اجتماعی مزاحمت کا حصہ بن چکا ہے، خواہ انہیں اس جدوجہد کے دوران مسلط کردہ خاموشی اور خوف کے گہرے سائے میں ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔

آخرکار انسانی ضمیر کے سامنے ایک واضح انتخاب موجود ہے: یا تو اس خوفناک مگر معمول بن چکی حقیقت کے محض تماشائی بنے رہیں، یا پھر اسے دیکھنے اور سننے کی اخلاقی ذمہ داری قبول کریں۔ یا ہم فراموشی اور خاموشی کے اس نظام کے ساتھ کھڑے ہوں جو ان کہانیوں کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے، یا پھر ان لوگوں کی جراتمندانہ یادداشت کے ساتھ جنہوں نے تمام تر مشکلات کے باوجود سب کچھ یاد رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بیبو بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

27 جنوری 2026

نہ اصول، نہ کوئی قانون، سب ایک تھیٹر کی طرح، اور کچھ نہیں

(No rules, no laws — all stage, a theatre, nothing else).

نہ اصول، نہ کوئی قانون
سب ایک تھیٹر کی طرح، اور کچھ نہیں

سب کچھ دیکھ لیا
پھر بھی کچھ اَن دیکھا ہے
سب کچھ سن لیا
پھر بھی کچھ اَن سنا ہے

مجھے بہت سارے الفاظ بولنے تھے
مگر الفاظ ہی مجھ میں نہ رہے

دشمن کہ جس نے
زخم دیے
میں اُس پہ رویا
مگر چلتا گیا،

دشمن کہ جس نے
گولی چلائی
میں لڑکھڑا گیا ضرور مگر،
پھر بھی آگے بڑھتا رہا

No rules, no laws—
all stage, a theatre, nothing else.

Saw everything, yet saw nothing.
Heard all, yet nothing was heard.

All the words I had to say,
yet I had no words.

They spilled.
I wept.
I marched.
They shot.

I was crippled, yet I moved
forward.
I was pulled.
I was killed.
Yet I stood.

مجھے گھسیٹا گیا
مجھے مار دیا گیا
پھر بھی میں رکا نہیں

پہلے میرے بھائیوں کو اٹھایا گیا
ایک بیٹا، ایک باپ

اور اب
ایک نئی داستان شروع ہوئی،
نئے پوسٹروں کی داستان
اب اُن کی نظر بہنوں کے چادر پر،
اب اُن کی نظر ماؤں کے چادر پر

انہوں نے کوکھ کو خاموش کرا دیے،
شناخت کو لاپتہ کیا،
سانس کو روک دیا

وہ جسے میری شناخت سے ڈر تھا
وہ جس نے مجھے میرے گھر سے لاپتہ کیا
میرے فرزندوں کے سامنے،
اور انہیں تاریخ کا گواہ بنا دیا

میری زمین چھین لی گئی،
میری شناخت چُور چُور ہوگئی،
میرے خیالات پر قدغن لگ گئی،

First they took my brothers A
son.
A father.

Now their eyes rest on the crown
—
my sisters.
my mothers.

They silence the womb.
Name unborn.
Breath undone.

They feared my identity
They disappeared me from my
home,
left my children behind
to witness them.

My land was snatched.
My dignity was torn.
My thoughts were blurred.
My slogans were prisoned.

They touched my motherland.

میری آواز گُھٹ کر رہ گئی

انہوں نے میری مادرِ وطن کو چھوا،

انہوں نے میری روح کو چھوا،
انہوں نے اپنے نشان میری روح پر چھوڑ دیے

They touched my soul.

They left their imprints—
filth
on my soul.

بیبو بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

30 دسمبر 2026

زمین کے وارث

(Born of the Land)

Born of the Land	زمین کے وارث
One year behind iron bars. One year beneath the weight of injustice. One year that tore away the mask from the face of the colonizer.	ایک سال باڑوں کے پیچھے ایک سال ناانصافی کے دلدل میں وہ ایک سال، وہ ایک مدت جس نے قبضہ گیر کی اصلیت کو واضح کیا
You thought prison would silence us. You thought walls would bury our voices.	تم نے سوچا کہ زندان ہماری زبان چھین سکتی ہے تم نے سوچا کہ دیواریں ہماری آواز کو دفن کر سکتی ہیں
But listen.	لیکن سنو!
The walls echo. The chains remember. The silence speaks.	دیواروں کی بازگشت ہوتی ہے زنجیریں یادوں کو نظم دیتی ہیں خاموشی کی بھی زبان ہوتی ہے
Days turned into weeks.	دن ہفتوں میں بدل گئے

Weeks into months. Months into a slow-burning fire in the hearts you tried to cage.	ہفتے مہینوں میں بدل گئے مہینے اُن دلوں میں سلگتی آگ بن گئے جنہیں تم نے جکڑنے کی کوشش کی
Our crime?	ہمارا جرم!
Standing for what is right. Speaking for what has always been ours.	حقیقت کا ساتھ دینا اپنی تاریخی میراث کے بارے میں بولنا
You thought we would break. You thought we would kneel. You thought we would beg for mercy.	تم نے سوچا ہم ٹوٹ جائیں گے تم نے سوچا ہم جھک جائیں گے تم نے سوچا ہم گڑگڑائیں گے
But we were not born to kneel. We were born of the land.	لیکن ہم جھکنے کے لیے نہیں بنے ہم اپنی زمین کے وارث ہیں
The land that fed us. The land whose mountains you scar with your bombs. The land whose gold and copper you steal. The land whose seas you plunder.	وہ زمین جس نے ہمیں پالا وہ زمین جس کے پہاڑ تم نے روند ڈالے وہ زمین جس کا سونا اور تانبہ تم نے لوٹ لیا وہ زمین جس کے سمندر کو تم نے تاراج کیا
And what do you return?	اور تم نے بدلے میں کیا دیا؟

Blood.	لہو!
The blood of its sons.	اس کے فرزندوں کا لہو
The blood of its daughters.	اس زمین کے وارثوں کا لہو
But hear this,	لیکن یہ سن لو!
A people can be imprisoned,	لوگ قید کیے جا سکتے ہیں
but a people cannot be erased.	لیکن لوگ مٹ نہیں سکتے
You can cage the body.	تم ایک جسم کو قید کر سکتے ہو
You can silence a voice.	تم ایک آواز کو خاموش کر سکتے ہو
You can bury a name.	تم ایک نام کو دفن کر سکتے ہو
But you cannot bury a truth	لیکن تم اُس حقیقت کو دفن نہیں کر سکتے
that rises from the soil itself.	جو اپنی مٹی سے جنم لیتی ہے
Remember this.	یہ یاد رکھو!
We will return.	ہم آئیں گے
We will return for the missing.	ہم گمشدگان کے لیے واپس آئیں گے
We will return for the caged.	ہم قیدیوں کے لیے واپس آئیں گے
We will return for the fallen.	ہم گرے ہوؤں کے لیے واپس آئیں گے
And when that day comes,	اور جب وہ دن آئے گا
the land itself will speak ,	زمین خود بول اٹھے گی
not in whispers,	سرگوشیوں میں نہیں

خوف میں نہیں	not in fear,
بلکہ گرج کی مانند بول اٹھے گی	but in thunder.
کیونکہ زیردست یاد رکھتے ہیں	Because the oppressed remember.
اور زمین خود بھی یاد رکھتی ہے	And the land remembers too.
کہ ہم جھکنے کے لیے نہیں بنے	And we were never meant to bow.

بیبو بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

17 مارچ 2026

باب پنجم : گل زادی بلوچ

تعارفِ گلزادی بلوچ

گُلزادی بلوچ 3 مارچ 2006 کو مچھ، بلوچستان میں پیدا ہوئی۔ اپنی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ گرلز پرائمری اسکول اور اسی طرح سیکنڈری تعلیم بھی گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول مچھ سے حاصل کی۔ اپنی روایتی تعلیم کے ساتھ، گلزادی نے قرآن پاک کی تعلیم بھی جاری رکھی، چھوٹی عمر میں ہی تعلیم کے حوالے سے نظم و ضبط اور پرجوش تھیں۔ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد، گُلزادی نے گورنمنٹ گرلز کالج مچھ میں داخلہ لیا، جہاں انہوں نے ایف ایس سی کے پروگرام میں ایڈمیشن لیا۔ تاہم 2022 میں اس کے کالج کے پہلے سال میں اس کے بھائی کو جبری گمشدگی کا شکار بنایا گیا۔ یہ حادثہ اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ لایا۔ اس کی تعلیم بہت متاثر ہوئی، کیونکہ وہ ہر ہفتہ کوئٹہ سفر کرتی، کمیشن کے سامنے پیش ہوتی، احتجاجوں کا حصہ بنتی اور اپنے جبری لاپتہ بھائی کی بازیابی کا مطالبہ کرتی۔باقاعدگی سے کلاسز میں حاضری نہیں ہو سکی اس وجہ سے شدید صدمے میں گئی ، اس سے قرآن پاک کے حفظ کرنے میں بھی خلل پڑ گیا، جسے وہ بڑے جوش و جذبے سے کرنا چاہتی تھیں۔ یہ سب اس کے بھائی کی جبری گمشدگی کی وجہ سے ہوا، اس کے بعد خاندان کے ساتھ کوئٹہ میں رہنے لگی۔

گلزادی نے دوبارہ انٹرمیڈیٹ مکمل کرنے کے بعد بلوچستان یونیورسٹی میں بی ایس انگلش لٹریچر کے پروگرام میں داخلہ لیا اور اپنا تعلیم جاری رکھی۔گلزادی کی سیاسی جدوجہد میں قدم رکھنا ایک ذاتی خواہش نہیں تھی بلکہ یہ ریاستی تشدد کے سبب ممکن ہوا۔ اس نے اپنا دکھ درد اپنے

لوگوں کے ساتھ بانٹنا شروع کیں، احتجاج اور دھرنوں میں شامل ہوتیں، حتی کہ اس کے بدلے اپنی یونیورسٹی کی کلاسز بھی چھوڑ دیتی تھی۔ اس نے شعوری طور پر بلوچ یکجہتی کمیٹی میں شمولیت اختیار کی، اور اپنے تجربات سے جبری گمشدگی کو گہرائی سے سمجھنا شروع کیا جو لوگوں اور خاندانوں پر اثر انداز ہوتی۔ اس نے یہ درد خاموش رہ کر سہہ تھا۔ وہ لوگ جو اس درد کے لمحات سے گزرے ہیں، اس درد کے بوجھ کو سمجھ سکتے ہیں، اور گلزادی ان میں سے ایک تھی جس نے یہ درد خود سہہ تھا۔

جس دن سے اس کا بھائی جبری گمشدگی کا شکار ہوا،تو گُلزادی نے اپنی زندگی سے نکل کر اپنے لوگوں کا انتخاب کیا۔ اس درد نے اسے بدل دیا۔ اس نے تسلسل کے ساتھ کوئٹہ کی گلیوں میں مزاحمت کا انتخاب کیا، پریس کلب سے لیکر دھرنوں تک، احتجاجوں سے لیکر عوامی اجتماعات تک۔ وہ مستونگ میں بلوچ راجی مُچی میں شامل ہوئیں، جہاں انہوں نے ریاستی کریک ڈاؤن کا سامنا کیا۔ اس نے بلوچ نسل کشی کو اجاگر کرنے کے لیے دالبندین کے جلسے میں بھی حصہ لیا۔

گلزادی بلوچ کی جدوجہد کے جواب میں ریاستی اداروں نے انہیں اور ان کے خاندان کو ہراساں کرنا شروع کردیا، ان کا کمرے تک پیچھا کیا، اور فون کالز کے ذریعے دھمکیاں دی گئیں تاکہ خوف پیدا کیا جائے اور انہیں خاموش کرایا جائے۔ لیکن خاموشی کبھی بھی ان کے لیے انتخاب نہیں تھی کیونکہ وہ ریاستی ظلم کو بہت قریب سے دیکھ چکی تھیں۔

اس بڑھتی ہوئی دھمکیوں کے درمیان، 12 مارچ کو، ریاستی افواج نے ان کے کمرے پر چھاپہ مارا اور گلزادی بلوچ کو جبری طور پر لاپتہ کر دیا، عوامی مزاحمت اور دباؤ کی وجہ سے انھیں اسی دن رہا کردیا گیا۔ گلزادی بلوچ کو 7 اپریل کو فرضی ایف آئی آرز کی بنیاد پر گرفتار کر لیا۔ وہ اب تقریباً ایک سال سے قید میں ہیں۔

ہماری عیدیں

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زمانے گزر گئے ہوں، خوشیوں کے موسم دیکھے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے یاداشت میں بس خزاں ہی خزاں ہے۔ یادوں کے ہر لہر خزاں کے خشک ہوا کی مانند غموں اور پیاروں سے دوری کی یاد دلاتی ہے۔ خوشیوں کے پھول تو مانو مرجھا گئے ہوں۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ پہلی عید قید میں اپنوں سے دور گزرے گی، اس سے قبل بھی تو ہم قید رہے ہیں خوف کے گھیرے میں۔ اپنوں سے دوری، انہیں کھونے کا ڈر۔ چند سال قبل گھر کا سوگوار ماحول اب تک میرے آنکھوں کے سامنے ہے، جہاں نہ کوئی خوشی تھی نہ کوئی احساس۔ یقیناً آج بھی آپ سب اسی کیفیت میں ہوں گے۔

ماں بن کر مجھے پالنے والی میری بہنیں، آپ لوگوں نے کبھی جیل اور تھانوں کے چکر اور ایسے مسائل کا تصور بھی نہ کیا ہوگا مگر آج میری وجہ سے آپ سب کی زندگیاں دشوار ہو گئی ہیں فرق بس اتنا ہے کہ کچھ سال پہلے میں آپ لوگوں کے پاس اپنے علاقے مچھ جیل میں تھی اور آپ سب مجھ سے ملنے آتے تھے، اپنے دکھ چھپا کر مجھے دلاسہ دیتے تھے، اور اب میں آپ سب سے دور اس جیل میں قید ہوں لیکن اب آپ کی چھوٹی بہن کمزور نہیں، وہ اب جیل کی سلاخوں سے نہیں ڈرتی، وہ قیدخانے کے اندھیرے سے نہیں گھبراتی اور یقیناً مجھے اتنا مضبوط بھی اسی جبر نے کیا کہ جس کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں آج میں آپ سب سے دور جھوٹے دہشتگردی کے مقدمات میں قید ہوں۔

بدقسمتی سے ہم غلام ہیں اور غلامی کی زندگی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

اور ہمیں بھی خود کو ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔

میرا حوصلہ بننے والی، مجھے ہمت دینے والی، اپنے آنسوں آنکھوں میں روک کر مجھے حوصلہ دینے والی میری بہادر بہنیں، آپ میرا حوصلہ ہیں۔

آپ کی قربانیوں پر مجھے فخر ہے اور آپ کی قربانیاں اور آنسوں کبھی رائیگان نہیں جائیں گے۔

اپنے قومی جہد پر قائم رہنے کا مجھے درس دینے والے میرے پیارے بھائی، آپ کی بہن کبھی کمزور نہیں ہوگی، اور نہ کبھی اپنے قوم کے لیے مشکل وقت میں قربانی دینے سے دریغ کرے گی۔ مجھے وہ آخری فون کال یاد ہے آپ کی جب آپ نے کہا "گل اپنا خیال رکھنا"۔ میرے سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے آپ سب بھی ریاستی بندوق کے دہانے پر ہیں، لیکن مجھے فخر ہے اس بات پر کہ باوجود ان سب کے آپ سب میرے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد ہم پھر سے ایک ساتھ ہوں گے۔

میرے بہادر بلوچ راج! آج کا دن ایک پرمسرت دن ہے جس میں لوگ اپنے پیاروں سے ملتے، انہیں عید مبارک دیتے ہیں، خوشیاں بانٹتے ہیں، مگر ہم زندگی کے ہر خوشی کی طرح اس مبارک دن کی خوشی کو بھی منانے سے محروم ہیں۔ بلوچ کا ہر گھر منتظر ہے اپنے لاپتہ فرزند کے لوٹنے کا اور سینکڑوں گھروں میں مسخ شدہ لاشوں کا درد بھرا ہے۔

اس عید مائیں صرف لاپتہ بیٹوں کے نہیں بلکہ ایک ماہ اپنی لاپتہ بیٹی ماہ جبین کی بھی انتظار میں ہیں۔ ہر خوشی کا دن ہمارے زخموں اور محرومی کو مزید تازہ کر جاتا ہے اور یہ محرومیاں اور اذیت محض حادثہ نہیں۔

امید اور یقین دو ایسی طاقتیں ہیں جن کے رہتے دشمن ہمیں کبھی شکست نہیں دے پائے گا۔ امید خوشحال اور خودمختار مستقبل کی اور یقین اپنے جدوجہد اور عمل پر کہ اس جہد کا ہر قدم ہمارے پرامن کل کی ان شاء اللہ ضامن ہوگا۔

وہ کل کہ جس میں ہمارے جوانوں کی لاشیں نہیں گریں گی، جس میں ہماری مائیں بہنیں بیٹیوں کی چادر کوئی کرائے کا قاتل نہیں کھینچ پائے گا، وہ خوشحال کل کہ جس میں کوئی مہاجر، غریب

مزدور اور کسان افلاس سے جان کی بازی نہیں ہارے گا، وہ خودمختار کل کہ جس میں کوئی وردی میں ملبوس درندہ کسی سفید ریش کی تذلیل نہیں کر پائے گا اور اس آنے والے کل میں بلوچ بھی عید کی خوشیاں منا سکے گا، پھر کوئی لاپتہ نہیں ہوگا، کوئی کسی کے مسخ شدہ لاش کے اوپر نہیں روئے گا۔

اُس آنے والے کل کے لیے جدوجہد ہمیں کرنی ہوگی کہ جس میں کوئی مظلوم کے خون سے ہولی نہ کھیلے، کوئی رہزن رہبر نہ کہلائے اور کوئی محسن کے روپ میں ہماری زندگیاں نہ چھینے۔ ہمیں عارضی نہیں بلکہ مستقل خوشیاں چاہیے جن کے چھن جانے کا ڈر کسی کے دل میں نہ ہو، کسی ماں کو اپنے بیٹے کے گمشدگی کا ڈر نہ ہو، کسی بیوی کو نیم بیوگی کا خوف نہ ہو، کسی بچے یا باپ کو اپنے بےسہارا ہونے کا ڈر نہ ہو۔

ہمیں اس کل کے لیے شب و سحر جدوجہد کرنا پڑے گا۔ جتنی قربانیاں ہم نے بحیثیت قوم دی ہیں، اس سے بڑھ کر مزید قربانیاں دینی پڑیں گی، تب بھی ہم تیار رہیں گے کیونکہ اکثر امن کا خواب دیکھنے والے انقلابی خود تو فتح کی خوبصورت صبح کو نہیں دیکھ پاتے، مگر اپنی نئی نسلوں کو مسخ شدہ تاریخ، تذلیل بھری زندگی اور غلامی کے دلدل سے آزادی دلا کر خود کو قربان کر دیتے ہیں۔

آج اگر ہم پابند سلاسل ہیں تو یہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ تحریک کبھی نہیں رکے گی۔ جب تک یہ ظلم جاری ہے، بلوچ قومی مزاحمت بھی اپنی بقا اور شناخت کے لیے جاری رہے گی، اور یہ تحریک قید و بند، قتل و غارت، اغوا کاری، پروپیگنڈے اور فوجی آپریشنز سے کمزور نہیں ہوگی۔

بلوچ راج! صبر، امید اور یقین کا دامن کبھی مت چھوڑو۔ ہمیں ہر حالت کے لیے خود کو تیار رکھنا ہوگا۔ کل ہمارے نوجوان اٹھائے جا رہے تھے تو آج ہماری خواتین اور بچیاں اٹھائی جا رہی ہیں۔ نسل کشی ہر روز تسلسل سے جاری ہے۔ سیاسی کارکنان کو دباؤ کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ لیکن ہمیں صبر اور تحمل سے کام لے کر ہر جبر کا جواب مزاحمت کرکے دینا ہوگا۔ خاموشی ترک کرکے آواز کو

مزید بلند کرنا ہوگا۔ ذاتی سوچ کو اجتماعی سوچ میں بدل کر ہمیں اس تحریک کا حصہ بننا ہوگا۔ تمام تر تضادات کو ختم کرکے یکجہتی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اور ہم پر جبر ڈھانے والے طاقتوں کو یہ پیغام دینا ہوگا کہ یہ مٹھی بھر لوگوں کی نہیں، بلوچ قوم کی تحریک ہے جسے دبانا اب تمہارے بندوق اور بموں کے بس کی بات نہیں۔

یہ بھی ہمارا ایمان ہے کہ بلوچ تحریک راکھ سے اٹھ کر بھی دشمن سے اس کے کیے ہر ظلم کا حساب لے گی، ہر اس کردار کو جواب دے گی جو بلوچ نسل کشی میں ملوث رہا ہے۔

گلزادی بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

7 جون 2025

بلوچ خواتین، ٹارچر سیلوں و بندوق کو مات دیں گے

بلوچستان میں جس امن کو لانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے پچھلے 80 سالوں میں جتنے فوجی آپریشنز کیے جا چکے ہیں اور جاری ہیں، اس امن کی تشریح اور مطلب بلوچ کے نزدیک بس اتنی ہے کہ اس امن کا (الف) بلوچستان میں انسانی جانوں، زمینی ساحل و وسائل کا استحصال، اس امن کا (م) ہزاروں بلوچ نوجوانوں کے مسخ شدہ لاشوں کی چیخ، اور (ن) بلوچ نسل کشی کی عکاسی کرتا ہے، جو بھرپور طریقے سے جاری ہے۔ ایک ہی ماہ یعنی مئی میں 25 سے زائد ماورائے آئین قتل اور 130 تک جبری گمشدگی کے کیسز سامنے آئے ہیں۔

یہ ریاستی عسکری قوت سمیت تمام اداروں کی روایت ہے کہ وہ عوامی مزاحمت میں شکست کھانے کے بعد عام عوام کو نشانہ بناتے ہیں۔ اور حسب روایت اپنی روایت دہراتے ہوئے اس بار بھی فوجی آپریشنز اور بھرپور عوامی تحریک سے مات کھانے کے بعد ریاستی فورسز نے بلوچ خواتین اور بچوں کو اپنی وحشیت کا نشانہ بنایا ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے دشمن کو اپنی تاریخ نہ ہونے کے باعث وہ ہماری تاریخ سے بھی ناواقف ہے۔ اور اسی لیے وہ ہر بار شکست کے بعد اپنا غصہ بلوچ خواتین اور بچوں پر نکالتا ہے۔ یہی وقت ہے کہ ہم اپنے جاہل دشمن کو اپنے بہادر خواتین کی تاریخ سے متعلق ان تمام تر شیرزالوں کے کردار سے واقف کرائیں جنہوں نے سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ جنگی محازوں اور میدانوں میں دلیری کی مثالیں قائم کی ہیں۔

میر نصیر خان نوری اور خداداد خان کی والدہ گنج جان بی بی انتہائی بہادر، مثالی کردار تھیں۔ وہ گھریلو زمینداروں کے ساتھ ساتھ خانیت کے فیصلہ سازی جیسے قابل خاتون تھیں۔

میر چاکر خان کی بہن بی بی بانڑی جنہوں نے 1556ء میں سوریوں کے خلاف پانی پت کی جنگ میں بلوچ فوجیوں کی کمان کی تھی۔ انہوں نے بلوچ لشکر کو بہادری سے میدان جنگ میں لڑنے کا حکم دیا۔ 1660ء سے 1696ء تک میر احمد اول کی بہن ماہی بیبو باروڑیئوں کے خلاف بہادری سے لڑتے ہوئے جان گنواہی۔ بی بی حانی سیمگ جیسی سینکڑوں بلوچ خواتین ہیں جنہوں نے تاریخ میں نام کمایا ہے۔

مزید برآں، 1977 کی جنگ میں جب فوج کو میدان جنگ میں بھرپور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو روایت دہراتے ہوئے انہوں نے بلوچ خواتین کو ہیلی کاپٹرز کے ذریعے زبردستی پنجاب لے گئے، مگر جنگ بھر بھی کمزور نہ ہوئی اور بے شک بلوچ خواتین جبر کے سامنے خود کو کمزور بننے نہ دیں۔ 2006 میں جب فوج نے بلوچستان میں فوجی آپریشن میں بستیوں کو جلا کر راکھ کیا، مال مویشی اور انسانوں سمیت، تو بلوچ ماؤں نے خود اپنے بیٹوں کو دعا دیتے ہوئے رخصت کیا کہ وہ دشمن کبھی پیٹھ پر گولی کھا کر گھر نہ لوٹے۔ تب بھی فوج نے بلوچ خواتین کو اپنے جبر کا نشانہ بنایا اور کئی کو لاپتہ کیا جن میں ایک سکول ٹیچر زرینہ مری جو اب تک لاپتہ ہے۔

بلوچ خواتین کی جبری گمشدگی کے کیسز کوئی نئی بات نہیں۔ ماہ جبین جو ایک طالبہ ہے، پچھلے کئی دنوں سے پاکستانی خفیہ ایجنسیز کے حراست میں ہے۔ بلوچ شناخت ہونے کے باعث وہ آج اس فہرست کا حصہ بنی ہے، جس کا حصہ پہلے رشیدہ، ماہل، گنج خاتون اور کئی بلوچ خواتین رہ چکی ہیں۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ بلوچستان میں جاری ریاستی جنگ کی سب سے بڑی وکٹم بلوچ عورت رہی ہے۔ اس نے ماں کی صورت میں جوان بیٹے کی جبری گمشدگی کا درد اور مسخ شدہ لاش کا بوجھ اٹھایا ہے۔ اس نے بیوی کی صورت میں نیم بیوگی اور ادھورے ارمان اور خوابوں کو دفنانے کا صدمہ سہہ ہے۔ بہن اور بیٹی کے کردار میں اپنے محافظ اور ساہبان کی تلاش میں میلوں تنہا سفر کیا ہے۔ معاشرے کی چبھنے والی نظریں اور رویہ سہے ہے۔ مگر وہ خاموش نہیں رہی یہاں تک کہ انہوں نے مہربان باپ، ساتھی، جیسے بھائی اور ازدواجی زندگی

کی خوشیوں کی مسخ شدہ لاش کے ٹکڑے بھی کندھوں پر اٹھائے ہیں اور اس لاش کے سرہانے اس کی بہادری اور شہادت کے لیے گیت بھی گائے ہیں۔

جس عورت نے گمشدگی جیسے کلیجہ چیر دینے والا درد اور مسخ شدہ لاشوں کو محبت سے بھرپور دل کے کونے میں دفنایا ہو، وہ بندوق یا ٹارچر سیل سے کیسے خوفزدہ ہو سکتی ہے؟

آج ریاست نے پھر سے بلوچستان میں اپنے قتل و غارت کا ننگا ناچ شروع کیا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ چند دہشتگردی کے جھوٹے مقدمات میں وہ مجھے، ڈاکٹر ماہ رنگ، بیبرگ، شاہ جی اور بیبو یا دیگر سیاسی کارکنان کو قید رکھے گی اور اس کے مظالم کے خلاف یہ تحریک رکے گی؟ ہرگز نہیں۔ ہمیں قید رکھنے کے باوجود اس کے ہاتھ میں بندوق اور تمام تر اختیارات ہونے کے باوجود وہ خوفزدہ ہے۔ اور یہی خوف اس کی شکست کی علامت ہے۔ 12 مارچ جب بندوق کی نوک میرے بھائی کے سر پر رکھ کر خفیہ ایجنسیز کے لوگ مجھے دھمکاتے لے گئے اور لاپتہ افراد کے لیے آواز اٹھانے اور BYC سے دستبردار ہونے کی دھمکی دی۔ پھر 7 اپریل مجھے دوبارہ جبری گرفتار کیا گیا۔ 23 اپریل کو بیبو کو حدہ جیل سے تشدد کرکے کینٹ لے جایا گیا۔ تو یہ تمام تر واقعات ریاستی حواس باختگی کا ثبوت ہیں کہ وہ بلوچ سے کس قدر خوفزدہ ہے۔

آج 20 روز گزر جانے کے بعد بھی مجھے یقین ہے کہ ماہ جبین ثابت قدم ہوگی۔ یقینا وہ اس عنہاسانی جبر کو قریب سے دیکھے گی اور مزید باہمت ہوئی ہوگی اور اپنی قوم سے یہ توقع کرے گی کہ وہ اس کے لیے آواز بلند کریں گے۔ ریاست نے یونس کی کمزوری سمجھ کر ماہ جبین کو جبری گمشدہ اور بلیک میلنگ کا ذریعہ بنانا چاہا مگر تاریخ گواہ ہے کہ بلوچ عورت نے کبھی جبر کے آگے سر نہیں جھکایا ہے۔

یہاں ہماری ذمہ داری اور فرض ہے کہ ہم ماہ جبین اور دیگر بلوچ خواتین کی قربانیوں کو سرہائیں، ان کی جدوجہد پر ننگ و ناموس کا ٹھپہ نہ لگائیں بلکہ ان کے انقلابی کردار کی قدر کریں۔ جب

تک عوامی تحریک سے تفریق ختم نہیں ہوگی، وہ تحریک اور وہ سماج کبھی ترقی نہیں کر پائے گا۔ جہاں عورت کو محض گھر کے کام کاج کے قابل ہی سمجھا اور برتا جائے۔

آئیے اپنی تحریک سے اس تفریق کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکیں اور (مرد و زن) بلا تفریق ریاستی مظالم کے خلاف یکجا، یک صف ہوجائیں۔ عورت کو اپنے انقلابی راہ اور جدوجہد میں رکاوٹ اور کمزوری سمجھنے کی بجائے اسے اپنے نظریہ اور فلسفہ کی وارث سمجھیں کیونکہ ایک انقلابی مرد کو ایک انقلابی ماں ہی جنم دے سکتی ہے۔ آئیے اپنے جنگی اور مزاحمتی صفوں میں خواتین کی شمولیت کو دل سے تسلیم کریں اور ان کی رہنمائی اور ہمرائی پر فخر کریں۔ اور اس ریاستی جھوٹے بیانیہ کو شکست دیں جو بلوچ عورت کو گھر کی عزت اور ننگ و ناموس کا نام دیتی ہے۔ آئیے یہ ثابت کریں کہ بلوچ عورت گھر کی عزت ہونے کے ساتھ میدان جنگ کی بہادر سپاہی بھی ہے۔ مذہبی، روایتی اور قبائلی تمام تر زنجیروں سے عورت کو آزاد کر کے اسے اپنے جذبات اور صلاحیتوں کے مظاہرے کا موقع دیں۔

آج اگر جو لوگ ماہ جبین کے واقعے کو ننگ و ناموس کا نام دیتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ بلوچ خواتین کی تاریخ پڑھیں۔ ایک ماں جب اپنے بیٹے اور بیٹی کو بہادری کا درس صبح کے گیت سے لیکر رات کی لوری تک سناتی ہے تو وہ ماں کے لیے قربانی کا عمل اور جذبے سے پیچھے رہ سکتی ہے۔ بلوچ عورت قربانی کے فلسفے کو بھی جانتی اور سمجھتی ہے اور خود اپنے دفاع، بقا اور قومی شناخت پر قربان ہونا بھی۔ بلوچ عورت نے کبھی جنگ کی حمایت نہیں کی مگر یہ تاثر بھی سراسر غلط ہے کہ وہ جنگی حالت یا دژمن کے نیزے کے آگے سر جھکائے پر مجبور ہوگی۔

آج بلوچ قومی تحریک کی قیادت بلوچ خواتین کے ہاتھوں میں ہے جنہوں نے مسخ شدہ لاشوں کے بکھرے ٹکڑے سمیٹے ہیں۔ جنہوں نے جبر سہہ کر بھی حق کے نعرے بلند کیے ہیں۔

بحیثیت بلوچ عورت یہ ہمارا ایمان ہے کہ ہم ریاستی جبر کے آگے کبھی کمزور نہیں ہوں گے اور اس قومی تحریک کو اپنے خون کے آخری قطرے اور آخری سانس تک آگے لے جائیں گے۔ یہ

تحریک راکھ سے اٹھ کر بھی دشمن سے حساب لے گی اور ہر اس کردار کا پردہ چاک کرے گی جس نے رہبر اور رہزن بن کر بلوچ کے خون سے ہولی کھیلی ہے۔

یہ تحریک بلوچ خواتین کی ہے اور انہیں ریاست اب اپنی بندوق اور بموں سے کمزور نہیں کر پائے گی۔ یہ ٹارچر سیل میں بند رہ کر بھی بندوق بردار کو مات دیں گے۔

دی بلوچستان پوسٹ: اس تحریر میں پیش کیئے گئے خیالات اور آراء لکھاری کے ذاتی ہیں، ضروری نہیں ان سے دی بلوچستان پوسٹ میڈیا نیٹورک متفق ہے یا یہ خیالات ادارے کے پالیسیوں کا اظہار ہیں۔

گلزادی بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

25 جون 2025

جبری گمشدگیاں اور بلوچ خواتین کی ناقابلِ شکست جدوجہد

بلوچ خواتین کی جبری گمشدگی کا کسی اتفاقی سانحے کا نتیجہ نہیں بلکہ ریاست کی ایک منظم اور سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے، جس کے ذریعے بلوچ قومی اقدار، روایات، ثقافت اور قومی حقوق کی جدوجہد کو براہِ راست نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ درحقیقت ریاست بلوچ خواتین کی فکری، عملی اور شعوری شمولیت سے شدید خوفزدہ ہے۔ اسی خوف کے تحت وہ بلوچ عورت کو اس کی قومی شناخت کی جدوجہد اور اس کے تاریخی و سماجی کردار سے دور کرنے، اسے پسِ پشت ڈالنے اور خاموش کرانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ ریاست بخوبی جانتی ہے کہ جب ایک عورت شعوری طور پر اپنی قوم کے لیے قربانی دینے کا حوصلہ اور عزم رکھتی ہے تو وہ صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ آنے والی نسلوں کے اذہان کو بیداری، شعور اور مضبوط قومی جذبے سے آراستہ کر دیتی ہے۔

اب نہایت غور و فکر کا کی بات یہ ہے کہ بلوچ عورت نے گھریلو زندگی کی محدود فضا سے نکل کر قومی شناخت کی جدوجہد تک کا سفر کیسے طے کیا؟ ایک خاندان کی دیکھ بھال اور پرورش سے لے کر قومی خدمت تک وہ کن مراحل سے گزری؟ آخر وہ کون سے حالات اور محرکات تھے جنہوں نے ایک بلوچ عورت کو، چاہے وہ ماں ہو، بیٹی، بیوی یا بہن، اس مقام تک پہنچایا کہ وہ ہر صورت اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہو کر اپنی پوری زندگی بلوچ قومی تحریک اور اپنی قوم کے لیے قربان کرنے پر آمادہ ہے؟ اور سب سے زیادہ تکلیف دہ سوال یہ ہے کہ گزشتہ چھ ماہ سے ایک بلوچ بیٹی، ماہ جبین، پاکستان کے ٹارچر سیل میں تشدد، تذلیل اور ہزاروں دیگر اذیتوں کے باوجود کس طرح زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہی ہے؟

درحقیقت کسی بھی معاشرے کا ارتقائی عمل مسلسل اور متواتر عوامل کے زیرِ اثر آگے بڑھتا ہے، جن میں معاشی عوامل افراد اور اداروں کے باہمی تعلقات، سیاسی تبدیلیاں اور سماجی اقدار

جیسے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں بلوچ معاشرے اور اس کے ارتقائی عمل کی نمائندگی اور تشریح کے لیے محض ایک جملہ ہی کافی ہے: یہ ریاست کے جبر اور تشدد کا مسلسل دہرایا جانے والا عمل ہے۔ اس میں جبری گمشدگی، اجتماعی سزا، اور سب سے سنگین اور غیر انسانی عمل یعنی ماورائے آئین قتل شامل ہیں، جن میں بلوچ لاپتہ افراد کو شہید کرنے کے بعد لاشوں کو مسخ کر کے بےحرمتی کے ساتھ لاوارث قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح فوجی آپریشنز اور ائیر اسٹرائیک کے ذریعے بلوچستان کے گاؤں اور قصبے تباہ کئے جاتے ہیں، جبری بے دخلی کی جاتی ہے، اور فوجی آپریشنز میں بلوچ خواتین اور بچیوں کی عصمت دری جیسے جابرانہ اقدامات معمول بن چکے ہیں۔

پچھلے سات دہائیوں سے بلوچ معاشرے پر ایسی غیر انسانی اور غیر قانونی پالیسیاں نافذ کی گئی ہیں، جن کے نتیجے میں بلوچ نسل کشی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس ارتقائی عمل میں بلوچ خواتین نے نہ صرف ریاستی جبر کو نزدیک سے محسوس کیا بلکہ اسے سہنے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف مزاحمت بھی کی۔ ایک عورت، جو برسوں اپنے خوشحال خاندان کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی، آج ریاستی فوج کے ظلم کے سامنے سڑکوں پر کھڑی ہے۔ وہ عورت آج تجابان (کیچ) کی سڑکوں پر صبح و شام گزشتہ احتجاجی دھرنے پر بیٹھ کر مزاہمت کا استعارہ بنی ہوئی ہے۔ اس مظلوم ماں نے گزرتے سال کا آخری غروبِ آفتاب اپنے غموں کے بوجھ تلے دیکھا، اور اسی سڑک پر نئے سال کی پہلی کرن کو نئے عزم اور جذبے کے ساتھ استقبال کیامگر اربابِ اختیار امن کے دعویداروں میں سے کسی نے اس ماں سے سڑک پر دھرنے کا سبب تک پوچھنا گوارہ نہ سمجھا۔

معاشرہ ہمیشہ انصاف، مساوات اور انسانی وقار کی بنیاد پر ہی امن اور خوشحالی کی طرف بڑھتا اور مستحکم ہوتا ہے۔ کسی بھی ریاست کے لیے اپنے عوام کو سیاسی، جمہوری، انسانی اور بنیادی حقوق کی فراہمی اولین ترجیح ہونی چاہیے، کیونکہ ان کے بغیر کوئی بھی معاشرہ ترقی اور فلاح کے قابل نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے بلوچستان دنیا کا وہ خطہ ہے جہاں جمہوریت، قانون اور

انصاف کے اصول معطل ہیں اور طاقت کا محور صرف ایک ادارے تک محدود ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے آج مجرم کے محافظ بن چکے ہیں۔ یہ وہی ادارے ہیں جو مجرم کی وکالت کرتے ہیں اور بے گناہ کی گردن پکڑ کر اسے سزا دیتے ہیں۔ عدلیہ بھی اپنے فیصلے سازی میں مقتول کے لہو سے اپنے قلم کی نوک تر کرتی ہے اور قاتل کو باعزت بری کر کے انصاف اور عدلیہ کی آزادی کا ڈھونگ رچاتی ہے۔ پاکستانی قانون کا دوغلا پن اپنی انتہا پر ہے مظلوم کے اپنے حقوق کے لیے اٹھائے جانے والے ہر آواز کو دہشت گردی، غداری یا غیر ملکی ایجنٹ جیسے الزامات کے تحت دبا دیا جاتا ہے، جبکہ جابر کو مزید جبر کے لیے آئینی ترامیم جیسی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ جمہوریت بذاتِ خود مظلوم کے لیے تو وجود نہیں رکھتی ہے، مگر یہاں یہ اشرافیہ اور ڈکٹیٹر کے لیے ڈھال کا کردار ادا کرتی ہے۔ ریاستی میڈیا ریاستی جبر کا سب سے بڑا آلہ کار بن چکا ہے۔ یہ میڈیا بلوچ مخالف اور بلوچ نسل کش پالیسیوں کو جواز فراہم کرنے کے لیے صفِ اول میں بیان بازی کرتا ہے۔ اگرچہ بعض حد تک میڈیا جمہوریت کے محافظ کا کردار ادا کرتا نظر آتا ہے، لیکن پاکستانی مین اسٹریم میڈیا آج محض طاقت کے منبع کا ترجمان بن چکا ہے، جو چند روپوں کے عوض اپنی ذمہ داری اور قومی فرائض پر سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

ڈیجیٹل میڈیا بلوچ خواتین، چاہے سیاسی ہوں یا غیر سیاسی، کی کردار کشی اور بلوچ نسل کشی پر پروپیگنڈہ پھیلا رہی ہے، جس کی کوئی حدبندی نہیں۔پرنٹ میڈیا کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں: پہلے صفحے سے لے کر آخر تک بلوچستان کے کسی حقیقی مسئلے پر ایک سطر بھی نظر نہیں آتی، اور صحافت کے نام پر کام کرنے والے افراد چند اشتہارات کے عوض اپنے قلم کی قدر و قیمت کو فراموش کر چکے ہیں۔ ریاستی بیانیہ اور بلوچ کی حقیقی زندگی کے درمیان تضاد اس حد تک شدید ہے کہ ترقی کے نام پر بلوچستان کے قدرتی وسائل کے بدلے میں جو "ترقی" دی جاتی ہے، دراصل وہ ہماری زمین بلوچ فرزندوں کی لاشیں اگلتی ہے۔ خوشحالی کے معنی ہر روز کسی کے گھر کے ایک فرد کے جبری گمشدہ ہونے سے ملتے ہیں۔ امن کے نام پر بلوچ کو اس کی زمین سے جبری بے دخل کیا جاتا ہے اور ریاست اپنے ہی عدم استحکام کو طول دیتی ہے۔

کچھ سال قبل ریاست بلوچ مردوں کو جبری طور پر لاپتہ کرکے متاثرہ گھر کی خواتین کو کمزور سمجھ کر چھوڑ دیتی تھی، مگر بلوچ خواتین نے بے بسی یا کمزوری کی علامت بننے کے بجائے قومی مزاحمت کو ترجیح دی۔ انہوں نے اپنے لاپتہ پیاروں کی بازیابی کے لیے تھانہ، عدالت، کچہری اور کمیشنز سب کے چکر لگائے، مگر جب کہیں امید نہ ملی تو انہوں نے سڑکوں کا رخ کیا۔یہاں سے بلوچ عورت ریاست کے جبر کے خلاف ایک نڈر سیاسی کارکن کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ ایک فرد کی انفرادی آواز بتدریج اجتماعی جدوجہد میں تبدیل ہوئی۔ وقت نے آہستہ آہستہ زخم بھرنے شروع کیے اور پھر ایک فرد کے نعرے نے بلوچ نسل کشی کے خلاف اجتماعی تحریک کو جنم دیا۔ ایک سوال نے قومی شناخت کی جدوجہد کی شکل اختیار کی اور سڑکوں کے اجتماعات نے راجی مچی کو تشکیل دیا۔ لانگ مارچ نے طویل مشکلات اور رکاوٹیں عبور کیں، جہاں عوام کے جم غفیر نے ظالم اور مظلوم کے درمیان لکیر کھینچی اور بلوچ خواتین کے کردار کو تاریخ میں نمایاں الفاظ میں جگہ دی۔ بظاہر یہ سفر آسان نہ تھا، اور اس تحریک کو بلوچستان کے ہر گھر تک پہنچانا بھی سہل نہ تھا، مگر بلوچ خواتین نے اپنے قومی شعور اور سیاسی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے تمام تر مشکلات کو عبور کیا اور بلوچ قومی تحریک میں مرکزی کردار ادا کیا۔ لانگ مارچ کے آغاز پر ان کے ہاتھوں میں اپنے پیاروں کی تصاویر تھیں، مگر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچتے پہنچتے بلوچ ماؤں اور بیٹیوں نے ذاتی مفادات پر قومی سوال کو ترجیح دی اور اپنی جنس کو کبھی کمزوری بننے نہ دیا۔

یہ ریاستی جبر ہی ہے جس نے بلوچ عورت کو اس حد تک مضبوط بنایا کہ وہ ماں، جس کے بیٹے کو ریاستی فوج نے بے دردی سے قتل کیا، اپنے اس جوان بیٹے کی لاش کو بھی قومی تحریک کے نام کرنے پر آمادہ ہے، اور اس کی آخری رسومات بھی بلوچ قومی ترانوں اور نظموں کے ساتھ ادا کرتی ہے۔ بلوچ خواتین کے سیاسی اور قومی شعور سے خوفزدہ ریاست نے اب انہیں بھی جبری گمشدگی کا نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے، جو ریاستی پالیسیوں کی ناکامی کا واضح ثبوت ہے۔ مگر وہ گمشدہ بلوچ بیٹی آج بھی ٹارچر سیل میں پاکستانی فوج کے ظلم کو سہہ رہی ہے، سڑکوں پر

تشدد کا مقابلہ کر رہی ہے، جیلوں میں حق کے نعرے بلند کر رہی ہے، اور اپنی زندگی کو بلوچ تحریک کے نام کرنے کے لیے تیار ہے۔

ریاست نے ہمیشہ بلوچ شیرزالوں کی جدوجہد کو طاقت کے زور پر ختم کرنے کی کوشش کی ہے، مگر جب طاقت کارگر ثابت نہ ہوئی تو اب جبری گمشدگیوں اور بلوچ خواتین کے کردار کو متنازع بنانے کے ہتھکنڈے اپنائے جا رہے ہیں، جن میں مذہب کو بطورِ ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے۔ خود کو اسلامی جمہوریہ کہلانے والی یہ ریاست درحقیقت اسلام کی تاریخ میں مسلمان خواتین کے سیاسی، جنگی اور جرات مندانہ کرداروں سے ناواقف دکھائی دیتی ہے، وہ خواتین جنہوں نے غلامی کی زندگی پر شہادت کو ترجیح دی۔ اپنی سرزمین کے دفاع، قومی شناخت کے تحفظ اور غلامی کے خلاف جدوجہد کی اجازت ہمیں اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصولوں سے حاصل ہوتی ہے۔ آج بلوچ خواتین بھی انہی اصولوں اور جذبوں کو عملی طور پر زندہ کر رہی ہیں۔ آخر میں، میں اپنی بلوچ قوم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہماری قوم کے ہر باشعور فرد کی جدوجہد اور قربانیوں نے اس تحریک کو اس قدر طاقتور بنا دیا ہے کہ ریاست اپنی تمام تر قوت کے باوجود بلوچ دشمن پالیسیوں کو آپ کے حوصلوں کے سامنے ناکام ہوتے دیکھ رہی ہے۔ اسی خوف کے باعث وہ آج بلوچ خواتین کو نشانہ بنا رہی ہے۔ ایسے میں آپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو کمزوری نہیں بلکہ اپنی قوت سمجھیں، انہیں مزید سیاسی اور قومی فرائض سے جوڑیں اور تعلیم کے مواقع فراہم کریں۔

آج اس مزاحمت میں ہمارا حوصلہ یہی ہے کہ ہم اپنی بلوچ ماں ہانی بلوچ سمیت ہر بلوچ فرزند کی بازیابی کے لیے جدوجہد جاری رکھیں اور اس غیر انسانی عمل کے خلاف انصاف کا مطالبہ کریں، کیونکہ انصاف کے بغیر کوئی بھی انسانی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یہ ہماری قومی ذمہ داری ہے کہ ہم بلوچ خواتین کی جبری گمشدگیوں کو معمول بننے نہ دیں، ریاستی بیانیے کو مسترد کریں اور اپنی جدوجہد کو پوری استقامت کے ساتھ آگے بڑھاتے رہیں۔ جنگ ایک بے رحم حقیقت ہوتی ہے اور دشمن کبھی جبر سے باز نہیں آتا، اس لیے ہمیں یہ خوش

فہمی بھی ترک کر دینی چاہیے کہ وہ ہماری خواتین پر رحم کرے گا۔ بلوچ بیٹیاں اپنی مرضی سے اس جدوجہد کا حصہ بنی ہیں؛ وہ نہ دشمن سے رحم کی اپیل کریں گی اور نہ ہی اپنے انقلابی نظریے پر کوئی سمجھوتہ کریں گی۔ جو ریاست یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ جھوٹے مقدمات کے ذریعے بلوچ خواتین کو خوف زدہ کر سکتی ہے، تو ماہل بلوچ کی استقامت اور حوصلے اس جبر کا جواب ہیں کہ بلوچ عورت ٹارچر سیل ،جھوٹے مقدمات کا مقابلہ کرکے ریاست کی اپنے بنائے گئے قانون کے تحت اسے شکست دیں کر سرخ روح ہوں گی۔

اتنے مظالم کے باوجود آج بھی تجابان کی سڑک پر ایک بلوچ ماں سراپا احتجاج ہے۔ایک طرف تمام سیاسی جماعتیں، عدلیہ اور میڈیا مل کر ریاستی اداروں کے قصیدہ خواں بنے ہوئے ہیں اور مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں، جبکہ دوسری جانب وہی دلیر بلوچ شیرزال سڑکوں پر حق کا پرچم تھامے ظالم کو للکار رہی ہیں اور اعلان کر رہی ہیں کہ وہ کبھی اپنے قومی حقوق سے دستبردار نہیں ہوں گی اور بلوچ نسل کشی کے خاتمے تک اس جدوجہد کو جاری رکھیں گی۔اگر ریاست کے پاس پوری مشینری ہے ہماری نسل کشی کرنے کیلئے ،تو ہمارے پاس بھی ایک زندگی ہے اپنے ملک و قوم پر قربان کرنے کیلئے جسے دہشتگردی کے بےبنیاد مقدمات خاموش نہیں کراسکتی ہیں۔

گل زادی بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

18جنوری2026

اماں ہوری کی یاد میں

جیجا ہوری وہ باہمت ماں تھیں جن کے بیٹے گل محمد مری کو چودہ برس قبل جبری گمشدگی کا نشانہ بنایا گیا، بیٹے کی جبری گمشدگی کے بعد انہوں نے جس صبر، حوصلے کے ساتھ جدوجہد کا آغاز کیا، وہ آخری سانس تک جاری رہا۔ انہوں نے ہر فورم پر اپنی آواز بلند کی، صرف اپنے بیٹے کی بازیابی کے لیے نہیں بلکہ تمام لاپتہ بلوچ افراد کے حق میں۔ ان کی پکار ایک ماں کی فریاد بھی تھی اور ایک قوم کی آواز بھی۔

انہوں نے جس ثابت قدمی سے مزاحمت کے شمع روشن رکھے، ریاستی جبر بھی اسی تسلسل سے انکے اور انکے خاندان کا تعاقب کرتا رہا۔ ان کی وفات بھی اسی طویل اذیت اور ریاستی جبر کے تسلسل کی ایک کڑی محسوس ہوتی ہے۔ حالیہ فوجی آپریشنز کے دوران ان کے گھر پر چھاپہ مارا گیا۔ ان کے کمسن بیٹے کو ریاستی اداروں کے اہلکاروں نے گھسیٹتے اور تشدد کرتے ہوئے گھر سے باہر نکالا۔ لمہ ہوری ننگے پاؤں اس کے پیچھے دوڑتی رہی ہاتھ جوڑ کر فریاد کرتی رہی کہ ان کا یہ بیٹا ان سے نہ چھینا جائے کیونکہ بلوچستان کے حالیہ حالات جن میں ہر گزرتے دن کیساتھ نوجوانوں کو جبری لاپتہ اور پھر فیک انکاؤنٹرز میں شہید کرنا ریاستی فوج کا معمول بن چکا ہے، اس خیال نے ہی لمہ ہوری کو بستر مرگ تک پہنچایا کہ کہیں اسکے بیٹے کو بھی ریاستی اہلکار اسی پالیسی شکار نہ بنائیں۔ اس کربناک منظر نے ان کے دل پر ایسا گہرا صدمہ ڈالا کہ وہ بے ہوش ہو گئیں۔ انہیں تشویشناک حالت میں اسپتال منتقل کیا گیا، جہاں وہ دو روز تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہیں اور پھر اپنے بیٹے کی یادوں، اپنی فریادوں اور ایک طویل انتظار کو دل میں سموئے اس جہان سے رخصت ہو گئیں۔

ریاستی جبر نے انہیں زندگی بھر کرب و اذیت میں مبتلا رکھا اور عمر کے آخری حصے میں بھی انہیں سکون نصیب نہ ہونے دیا۔ جیجا ہئوری ایک دلیر ماں، ثابت قدم انقلابی کارکن اور بلوچ

تحریک کی توانا آواز تھیں۔ میں نے انہیں ہر احتجاج، ہر دھرنے اور ہر عوامی اجتماع میں موجود پایا۔ اپنے پہلے سیاسی سفر، لانگ مارچ 2024، کے دوران بھی میں نے انہیں ہر روز نئے عزم اور تازہ امید کے ساتھ کیمپ میں متحرک دیکھا۔

اسلام آباد کی وہ رات آج بھی میرے دل و دماغ میں تازہ ہے جب پولیس نے تاریکی میں ہم پر حملہ آور ہو کر ہماری بزرگ ماؤں کو گھسیٹتے، مارتے پیٹتے بسوں میں دھکیل دیا۔ گویا یہ پیغام دیا جا رہا تھا کہ بلوچ کبھی شہراقتدار کا رخ کرنے کی جسارت نہ کریں۔ مگر ہماری باہمت ماؤں نے اس جبر، تشدد اور انتقامی کارروائی کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ ریاست کی جانب سےانسانی حقوق، اخلاقی اقدار اور آئینی تقاضے سب پامال کیے گئے، حتیٰ کہ بلوچ خواتین کی چادروں کی حرمت بھی اسلام آباد کی سڑکوں پر محفوظ نہ رہ سکی۔

تاہم بلوچ ماؤں نے ثابت کر دیا کہ نہ تشدد انہیں توڑ سکتا ہے اور نہ ریاستی جبر ان کی مزاحمت کو خاموش کرا سکتا ہے۔ اسلام آباد ہو یا راجی مچی، دالبندین (25 جنوری 2025)، لمہ ہئوری نے اپنی ضعیف العمری اور کمزور جسم کے باوجود ہر کٹھن سفر طے کیا۔ ان کی آنکھوں میں انتظار کی نمی تھی مگر عزم میں کوئی لغزش نہ تھی۔

25جنوری کی وہ رات بھی یادگار ہے جب ہم 49 خاندان ایک ہی گھر میں مقیم تھے۔ بستر کم پڑ گئے تو سب پریشان ہو گئے۔ اس موقع پر لمہ ہئوری نے نہایت مہربان اور نرم لہجے میں سب سے کہاکہ: "ہمیں عارضی سہولیات کی کمی پر افسردہ ہونے کے بجائے اس مقصد کو پیش نظر رکھنا چاہیے جس کے لیے ہم اتنی دور سے آئے ہیں، یعنی یکجہتی۔ غربت اور مشکلات زندگی کا حصہ ہیں، مگر ہمیں یہ وقت خوش دلی سے اور باہم محبت کے ساتھ گزارنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرائیں اور پھر اسلام آباد کے دھرنے کے ایام اور وہاں پیش آنے والے غیر انسانی اور غیر اخلاقی واقعات کا تذکرہ کرنے لگیں۔

لمہ ہوری ان شیر دل بلوچ ماؤں میں شامل تھیں جنہوں نے اپنی ذاتی اذیت کو قومی شعور میں ڈھال دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک بلوچ قومی تحریک کے لیے خود کو وقف کیا۔ اسلام آباد دھرنا 2025 کے دوران، شدید گرمی کے باوجود، وہ مسلسل موجود رہیں اور واضح الفاظ میں کہا کہ جب تک ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ، بیبرگ بلوچ، گل زادی، شاہ جی اور بیبو کو رہا نہیں کیا جاتا، وہ دھرنا ختم نہیں کریں گی۔

بعد ازاں جب وہ ہدہ جیل میں ہم سے ملنے آئیں تو ان کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں اداسی ساتھ ساتھ تھیں، خوشی ہم سے ملاقات کی اور دکھ ہمیں قید میں دیکھنے کا۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے پُرعزم لہجے میں کہا (ہواری ء سنگت)

لمہ جان آپ کی جدوجہد نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بلوچ قوم کو نہ خاموش کرایا جا سکتا ہے اور نہ جھکایا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کے پاس بہادر، مستقل مزاج دلیر اور قربانی دینے والی مائیں موجود ہیں۔ وہ مائیں جو غربت کی چکی میں پستے ہوئے اور جبری گمشدہ بیٹوں کی جدائی سہتے ہوئے بھی زندہ رہ سکتی ہیں، مگر غلامی اور خاموشی کی زندگی کبھی قبول نہیں کرتیں۔

لمہ جان، آپ کی جدوجہد، آپ کا صبر اور آپ کی استقامت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ہم آپ کی مزاحمت کی راہ کو کبھی ویران نہیں ہونے دیں گے۔ آپ کی خدمات اور قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

گل زادی بلوچ

ہدہ جیل کوئٹہ

23 فروری 2026

سنگت نظرمری کے نام

یہ تحریک اپنے دامن میں اُن کرداروں کو خود جنم دیتی ہے جو اس جدوجہد کے ساتھ مکمل خلوصِ نیت سے وابستہ ہوتے ہیں اور اپنے تمام جذبات، خیالات، خواب، حتیٰ کہ اپنی زندگی اور ذات تک قوم کے نام وقف کر دیتے ہیں۔

ایسے بے شمار کردار اس تحریک کی تاریخ میں پوشیدہ ہیں جن میں سے ہزاروں کو ہم نہ جانتے ہیں اور نہ ہی کبھی دیکھ پاتے ہیں۔ وہ وطن کی محبت میں اپنے لہو سے ظلمت کے اندھیروں کے خلاف امید کے چراغ روشن کرتے ہیں، خود کو نئی صبح کی روشنی کے لیے راکھ کر کے ہمارے لیے اُمید کی نئی کرن چھوڑ جاتے ہیں۔ ہزاروں بے نام وطن پرست اس جدوجہد میں زندانوں کی نذر ہو جاتے ہیں اور زندگی و موت کی کشمکش میں آخری سانس تک ہماری بقا کی جنگ لڑتے ہوئے ٹارچر سیلوں اور جعلی مقابلوں میں شہید کر دیے جاتے ہیں۔

ایسا ہی ایک کردار میں نے اپنے ابتدائی سیاسی سنگت میں دیکھا۔ اس میں نہ ذاتی مفاد کی خواہش باقی تھی، نہ آرام دہ زندگی کی طلب۔ تعلیم، حسرتیں اور رشتے سب کچھ پیچھے چھوڑ کر اُس نے صرف وطن کو چنا تھا اور وطن کے خوشحال کل کی خاطر بلوچ قومی تحریک سے وابستہ ہو گیا تھا۔ خصوصاً اُن حالات میں جب بلوچ نوجوانوں کو جبری طور پر لاپتہ کرنا اور اُن کی مسخ شدہ لاشیں پھینک دینا ریاست اور اس کی فورسز کا معمول بن چکا تھا۔ جس دوست کے ساتھ چند لمحے پہلے آپ بیٹھے ہوتے، اگلے ہی لمحے اس کی گمشدگی کی خبر سننا ایک عام واقعہ بن گیا تھا۔ مگر وہ ان تمام حالات کے باوجود ہمیشہ نئے جذبے کے ساتھ ساتھیوں کو حوصلہ دیتا اور کہا کرتا تھا:

"قوم ظلم کا شکار ہے، مائیں اور بہنیں سڑکوں پر گھسیٹی جا رہی ہیں، نوجوان مارے جا رہے ہیں، ہمیں ہر حال میں آگے بڑھنا ہے، لڑنا ہے اور آواز اٹھانی ہے۔"

آج قومی تحریک کا وہ نڈر سپاہی، نظر مری، ریاستی ٹارچر سیل میں قید ہے۔ گزشتہ سال اگست میں ریاستی فورسز نے انہیں جبری گمشدگی کا نشانہ بنایا اور تاحال وہ لاپتہ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہزاروں بلوچ لاپتہ نوجوانوں کی طرح نظر مری بھی دن رات غیر انسانی تشدد کا سامنا کرتے ہوئے بلوچ قومی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

نظر مری ایک ثابت قدم اور مستقل مزاج سیاسی کارکن ہیں، جو عام حالات سے لے کر ریاستی کریک ڈاؤن تک اپنے نظریے اور قومی وفاداری پر ڈٹے رہے۔ جب سڑکوں پر ریاستی فوج پرامن مظاہرین پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں اور چوراہوں پر بلوچ جوانوں اور کمسن بچوں کی لاشیں پڑی تھیں، تب بھی وہ ہر مظاہرے اور دھرنے میں پیش پیش تھے۔ ایک مخلص اور مضبوط سیاسی کارکن میں جو خصوصیات اور صلاحیتں درکار ہوتے ہیں، جو اسے سیاست کے کٹھن دور میں بکھرنے یا سمجھوتہ کرنے سے بچائیں۔ وہ تمام خصوصیات ان کی شخصیت میں موجود تھیں۔

سنگت نظر مری کی طویل جبری گمشدگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ اپنے سیاسی نظریے اور قومی وفاداری کے عہد پر قائم ہیں۔ قومی تحریک سے غداری نہ کرنے کے سبب انہیں اس جبر کا نشانہ بنایا گیا۔ انہوں نے آزاد زندگی میں جس طرح دن رات اپنے سیاسی اور قومی فرائض انجام دیے، اسی طرح زندان میں قید ہو کر بھی ہر لمحہ وہ ریاستی جبر کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تشدد اور قید و بند انہیں کبھی توڑ نہیں پائیں گے۔

ہماری دعا ہے کہ ہر بلوچ جبری لاپتہ فرزند کو اللہ تعالیٰ ہمت، صبر اور استقامت عطا فرمائے اور وہ ریاستی ٹارچر سیلوں سے زندہ و سلامت واپس لوٹیں۔

گل زادی بلوچ
ہدہ جیل کوئٹہ
6 مارچ 2026

انصاف کا جنازہ : بلوچستان میں عدلیہ اور ریاستی جبر کی کہانی

کسی بھی مہذب معاشرے میں عدلیہ کو جمہوری نظام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہی وہ ادارہ ہے جو انصاف، برابری اور قانون کی بالادستی کو یقینی بناتا ہے۔ جب عدلیہ آزاد ہو تو معاشرے میں امن، بھائی چارہ اور خوشحالی فروغ پاتے ہیں، اور عوام کا ریاست اور اس کے نظام پر اعتماد بحال ہوتا ہے۔ ایک خودمختار عدلیہ حکومتی اداروں کو احتساب کے دائرے میں لانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور بدعنوانی، جانبداری اور ناانصافی کے خلاف مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ یہ عوامی حقوق کے تحفظ کو یقینی بناتے ہوئے ریاستی اداروں کو قانون کا پابند بناتی ہے۔

اس کے برعکس، ایک غلام عدلیہ وہ ہوتی ہے جہاں قوانین اور ان کی شقیں طاقتور طبقات کے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ایسے نظام میں فیصلے انصاف اور حقائق کی بنیاد پر نہیں بلکہ طاقت اور دولت کے اثر و رسوخ کے تحت کیے جاتے ہیں۔ گواہیاں بھی ذاتی مفادات کے تابع ہو جاتی ہیں، اور مظلوم انصاف سے محروم رہتا ہے۔ خوف اور جبر کے ماحول میں عدلیہ اپنا اصل کردار کھو دیتی ہے اور یوں ناانصافی، بدامنی اور ظلم کو فروغ ملتا ہے۔ ایسی عدلیہ دراصل جابر ریاست کے لیے سہولت کار بن جاتی ہے، جہاں کمزور کے حقوق پامال اور طاقتور کے مفادات کو تحفظ دیا جاتا ہے۔

اگر اس تناظر میں بلوچستان کی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو عدلیہ کے کردار کو سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ جبری گمشدگیاں، جو کہ ایک سنگین انسانی المیہ ہیں، بدقسمتی سے معمول بنتی جا رہی ہیں۔ یہ کسی معاشرتی تقدیر کا حصہ نہیں بلکہ ریاستی جبر کی ایک شکل ہے، جسے عدالتی

کمزوری اور قانونی نظام کی خامیوں نے مزید تقویت دی ہے۔ ایسے واقعات نہ صرف انسانی حقوق کی پامالی ہیں بلکہ عدلیہ کی آزادی اور قانون کی بالادستی پر بھی سوالیہ نشان ہیں۔

ایک بلوچ نوجوان جسے جبری گمشدگی کے بعد عدالت میں پیش کیا جاتا ہے، اور پھر پیشی کے فوراً بعد گولیاں مار کر جعلی انکاؤنٹر کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے، یہ صرف ایک فرد کی جان لینے کا واقعہ نہیں، بلکہ عدلیہ کی خودمختاری، آزادی اور قانون کی حکمرانی کا بھی قتل ہے۔یہ وہ منظرنامہ ہے جہاں ایک مخصوص طبقے کو کھلی چھوٹ دے کر اجارہ داری قائم کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں یہ سوال مزید اہم ہو جاتا ہے کہ مستقبل قریب میں اس کے نتائج کتنے بھیانک ہو سکتے ہیں، اور اس کے اثرات معاشرے کی بنیادوں کو کس حد تک ہلا سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے، ہم سب کسی نہ کسی حد تک اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔

اب ذرا اس عدالتی نظام کا حال دیکھیے جس کا تماشا ہر ہفتے ہدہ جیل میں لگایا جاتا ہے (ATC Special Court)۔ یہ وہ عدالت ہے جہاں انسدادِ دہشتگردی کے مقدمات کی سماعت ہوتی ہے۔ ایک مقدمے میں ملزم پر نہایت سنگین نوعیت کے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ سرکاری مؤقف کے مطابق اس نے سڑکوں پر توڑ پھوڑ، جلاؤ گھیراؤ، ریاست مخالف نعرہ بازی، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے اور دہشتگردی جیسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔

لیکن جب ہم ملزم کی حقیقت پر نظر ڈالتے ہیں تو تصویر یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ رسول بخش ایک نہایت ضعیف العمر، تقریباً 80 سالہ بزرگ ہیں، جنہیں ان کے ایک معذور بیٹے اور دو کمسن پوتوں کے ساتھ دہشتگردی کی دفعات کے تحت پہلے غیر قانونی طور پر گرفتار کیا گیا، پھر MPO3 کے تحت حراست میں رکھا گیا، اور اب نمائشی عدالتوں میں اجتماعی سزا (collective punishment)کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ہر ہفتے وہ اپنی کمزور اور لرزتی ہڈیوں کے ساتھ جیل

کے دروازے پر گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں، صرف اس انتظار میں کہ ان کی حاضری کب لگے گی۔ یہ منظر نہ صرف ایک فرد کی اذیت کو ظاہر کرتا ہے بلکہ پورے نظام کی بے حسی کو بھی عیاں کرتا ہے۔ ان مقدمات میں 16 اور 14 سال کے بچے بھی شامل ہیں، جنہیں گزشتہ سال مختلف جگہوں؛اکیڈمیوں، دکانوں، سبزی کی ریڑیوں، گیراجوں یا مزدوری کے دوران جبری طور پر لاپتہ کیا گیا تھا۔ اس عمل نے جہاں ان کی تعلیم کو شدید نقصان پہنچایا، وہیں اب انہیں ہر ہفتے عدالت میں پیشی کے نام پر ذہنی دباؤ اور مسلسل اذیت سے دوچار کیا جا رہا ہے۔

معزز جج کو ان بچوں کے نام تک معلوم نہیں، مگر دہشتگردی کی دفعات ایسے دہرائی جاتی ہیں جیسے کوئی اسکرپٹ ازبر کر لیا گیا ہو۔ اس عدالت میں عزتِ نفس کی پامالی، تذلیل اور خوف کا ماحول غالب ہے۔ سرکاری وکلا کی تائید، سیاسی کارکنوں اور عام شہریوں کو دباؤ میں رکھنا یہی عناصر عدالتی رویے میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔یہاں سرکاری مؤقف کے علاوہ کسی کی بات سننے کی روایت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ متاثرین کو یہ کہہ کر خاموش کرایا جاتا ہے: "بولتے رہو، تمہاری سنتا کون ہے؟"معصوم نوجوانوں اور بچوں کو زبردستی دستخط کروانے کے بعد فوری طور پر باہر نکال دیا جاتا ہے۔ سی ٹی ڈی کے اہلکار انہیں بازوؤں سے پکڑ کر عدالت میں لاتے اور لے جاتے ہیں، جیسے ان پر جرم ثابت ہو چکا ہو۔ یہ تمام عمل انصاف کے بنیادی اصولوں کی صریح نفی کرتا ہے۔

یہی وہ رویے ہیں جو ایک نوجوان کے اندر گہری مایوسی پیدا کرتے ہیں۔ جب وہ بار بار ناانصافی، تضحیک اور بے بسی کا سامنا کرتا ہے تو انکے سامنے جنگی منافہ خور طبقےکے قانون کی بالادستی، عدلیہ کی ازادی اور جمہوری دعوے محض کھوکھلے نعرے بن کر رہ جاتے ہیں۔ایسے میں وہ اپنی راہ خود چننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ اسے اس راستے کی طرف دھکیلنے میں یہی عدلیہ، یہی قانون اور یہی نظام اپنا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔

بالآخر یہ امر بلا جواز کہا جا سکتا ہے کہ ایک مستحکم، خودمختار اور ازادعدلیہ ہی کسی بھی مہذب معاشرے کی اساس ہوتی ہے۔ جب تک قانون کی بالادستی مستحکم نہ ہو اور عدلیہ حقیقی معنوں میں آزاد نہ ہو، اس وقت تک حقیقی انصاف کا حصول محال رہے گا۔ لہٰذا ایک ایسے نظامِ عدل کی تشکیل ناگزیر ہے جہاں ہر فرد کو بلا امتیاز و تفریق انصاف کی فراہمی یقینی بنائی جا سکے۔

گل زادی بلوچ
ہدہ جیل کوئٹہ
22مارچ 2026

مزاحمت صرف سڑکوں پر ہونے والا احتجاج نہیں ہوتی۔ یہ یادداشت کا تسلسل ہے، سوال اٹھانے کی جرات ہے اور اصولوں پر قائم رہنے کا نام ہے۔ اگر اسے خاموش کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، اور اگر اسے محدود کیا جائے تو یہ اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔

''مزاحمتی یادداشت'' دراصل ایک اجتماعی یادداشت کی حفاظت ہے۔ یہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب قید کے اندر بیٹھ کر بھی نظریہ زندہ رکھا گیا، جب تحریر کو ہتھیار بنایا گیا، اور جب خاموشی کو گواہی میں بدل دیا گیا۔ یہ صفحات صرف موجودہ لمحے کے لیے نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کے لیے محفوظ کیے گئے ہیں۔

''مزاحمتی یادداشت'' ایک سالہ اسیری کی یاد تو ہے، مگر شکست کی نہیں بلکہ استقامت اور حوصلے کی علامت ہے۔ یہ میگزین کسی سانحے کی ماتمی روداد نہیں بلکہ عزم کی تجدید کا اظہار ہے۔ یہ ان دنوں کی دستاویز ہے جن میں وقت سست پڑ جاتا ہے مگر یقین کی رفتار کم نہیں ہوتی۔ یہ اس سفر کی علامت بھی ہے جس میں پابندِ سلاسل رہتے ہوئے بھی انسان اپنے مقصد اور اپنے یقین سے غافل نہیں ہوتا۔

برمش پبلیکیشنز
بلوچ یکجہتی کمیٹی